نئے پرانے

شاد عظیم آبادی

بدق اکیڈیمی

اشاعت منزل اردو گلی حیدرآباد دکن

نومبر ۱۹۴۴ء

طبع اوّل

مطبوعہ محمودیہ مشین پریس چارمینار حیدرآباد دکن

قیمت (

تعداد (۱۰۰۰)

صفحہ

قارئین سے

اُردو کے افسانہ نگاروں میں سہیل عظیم آبادی کسی تعارف
کے محتاج نہیں، اُن کے افسانے ملک کے متعدد وقیع رسالوں میں شائع
ہو کر اہلِ نظر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

سہیل صوبۂ بہار کے آسمانِ ادب کے درخشندہ ستارے
ہیں اُن کے آرٹ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے صوبے کے
مختلف طبقات کے حالات و معاشرت کا بہت غور سے مطالعہ کیا ہے
اور اپنے مطالعہ کا نتیجہ نہایت خوبی سے سپردِ قلم کیا ہے، وہ اپنے افسانوں
میں رنگوں سے نہیں الفاظ سے مصوری کرتے ہیں، جس سے پڑھنے والا
متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا بلکہ اکثر اپنے آپ کو اسی ماحول میں گم کر دیتا ہے

اُن کے افسانوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ
اُن کے اکثر و بیشتر افسانے اپنے اندر کوئی نہ کوئی اصلاحی پہلو لئے ہوئے
ہوتے ہیں لیکن لطف یہ ہے کہ ان افسانوں پر وعظ و پند کا شبہ نہیں ہوتا
بلکہ اس لطیف و اعلیٰ پہلو کو افسانے میں سمونے کے باوجود کہانی کی دلچسپی
میں کوئی فرق نہیں آتا۔

عموماً ان کے افسانے دیہات کے ماحول اور دیہاتی

معاشرہ سے متعلق ہوتے ہیں۔

وہ بعض جگہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو دیہاتی زبان کے میٹھے اور رسیلے الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ زندگی کے درد، دکھ مجسم تصویر بن کر سامنے آجاتے ہیں اور انسانی مظلومیت پر پڑھنے والے کے منھ سے بے ساختہ ایک آہ نکل جاتی ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ "نئے پرانے" سہیل کے (۱۳) افسانوں کا مجموعہ ہے اور ہر ایک افسانہ اپنی جگہ ایک مستقل شاہکار ہے۔ جن سے اُن کی ہمہ گیر طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے، زبان و بیان کے اعتبار سے بھی سہیل صاحب کی کوشش و کاوش قابلِ داد ہے، غیر ضروری اور بھرتی کے الفاظ اُن کے یہاں بہت کم ہیں، اُن کے اندازِ تحریر میں ایک ایسا اختصار ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔

دیہاتی زندگی کے مناظر کی تصویریں وہ اس نزاکت سے صفحۂ کاغذ پر کھینچتے ہیں کہ افسانے کا لطف کئی گونہ بڑھ جاتا ہے

ہمیں توقع ہے کہ اُن کا یہ مجموعہ پسندِ خاطرِ خاص و عام ہوگا

علی شبر حاتمی (بی۔ ایس سی)

گھری سے گھری تاریکی میں کوئی روشنی نظر آتی ہے
اس میں راہ ڈھونڈنے والے راہ پالیتے ہیں۔ اور جو آنکھیں پھیر
لیتے ہیں وہ اندھیرے میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ کیوں کہ روشنی
سدا جلتی نہیں رہتی۔

بھادوں کا مہینہ تھا آسمان پر کالے کالے
بادل چھائے ہوئے تھے۔ ایسا اندھیرا تھا کہ پاس کی بھی کوئی
چیز دکھائی نہ پڑتی تھی۔ پروفیسر رشید اور اس کا دوست
یوسف شکار سے واپس آرہے تھے۔ دونوں تھک کر
چُور تھے۔ یہ بھی پتہ نہ چلتا تھا کہ راستہ کدھر ہے؟ بھوک سے
حالت خراب ہو رہی تھی۔ دونوں میں دو چار قدم چلنے کی بھی
ہمت نہ تھی۔ لیکن مجبوراً ایک پگڈنڈی پر قدم بڑھائے چلے
جا رہے تھے۔ ان کا آخری سہارا ایک جھلملاتی ہوئی امید تھی

شاید کوئی جگہ پناہ لینے کو مل جائے۔

پروفیسر رشید کا معمول تھا۔ کہ ہر اتوار کو بندوق لے کر شکار کے لیے نکل جاتا تھا۔ وہ اپنی صحت کو قائم رکھنے کے لیے اسے ضروری سمجھتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ہفتہ بھر کی دماغی کلفتوں کا علاج صرف یہ ہی ایک ہوسکتا ہے۔ لیکن اس رات کو اُسے اتنا زیادہ بھٹکنا پڑا تھا کہ شکار سے اس کی طبیعت کو نفرت ہوچکی تھی۔ وہ کبھی کبھی سوچتا کہ یہ آخری شکار پارٹی تھی۔ شاید اس لیے بھی کہ راستے کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے خود کسی ناگہانی آفت کا شکار نہ بننا پڑے دیر تک دونوں بھٹکتے رہے۔ رشید آگے تھا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ یوسف اسے نظر نہ آیا۔ اُس نے پوچھا۔

"کہاں ہو یوسف!"

"یوسف نے جواب دیا۔"

میں بھی تمھیں نہیں دیکھ رہا ہوں محض انداز پر چل رہا ہوں۔"

"معلوم ہوتا ہے یوسف" رشید نے کہا۔" ہم لوگوں کی یہ رہ کبھی ختم نہ ہوگی۔ شاید ہمارا یہ ہی راستہ آخری منزل تک پہنچا دے۔"

"مایوس کیوں ہوتے ہو؟" یوسف بولا "شکار کا لطف کچھ اسی میں ہے۔"

"مگر مجھے بڑی الجھن ہو رہی ہے۔ یوسف!"

"کیوں؟ چلے چلو یار۔ یہ بھی ایک ایڈونچر (Adventure) ہے۔"

"تمھیں شرارت سوجھتی ہے۔ یوسف! مجھے الجھن ہو رہی ہے۔ کل کا میرا سارا پروگرام خراب ہو جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا تجربہ ختم ہو جائے۔ جانتے ہو، تین سال سے محنت کر رہا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ کل کا دن میرا خراب جائیگا"

"ہوا یار۔ ایک دن اور بھی اتوار ہی سہی۔"

"نہیں اب میں شکار کی عادت چھوڑ دوں گا۔ آئندہ کوئی دوسرا مشغلہ صحت کو قائم رکھنے کے لیے شروع کرونگا۔"

"دیکھا جائے گا۔ ابھی چلے چلو جدھر یہ پگڈنڈی لے جائے۔"

چند قدم دونوں اور بھی چلے۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ پہلے ہی کی طرح۔ یوسف نے چاروں طرف دیکھا اسے ایک طرف روشنی نظر آئی۔ وہ بولا۔

"شکر ہے خدا کا۔ رشید وہ دیکھو سلئے ہاتھ

کی طرف روشنی نظر آرہی ہے"

رشید نے مڑکر دیکھا۔ واقعی جھلملاتی ہوئی روشنی نظر آئی۔ پھر غائب ہوگئی۔ دونوں کو تعجب بھی ہوا۔ کچھ وہم بھی مگر پھر دونوں اُسی طرف چلے۔ جو بھی ہو۔ ایسے آخر کہاں تک چلے جائیں گے۔ کچھ دور چل کر رشید نے کہا۔

"یوسف نہ جاؤ! شاید آگے دلدل ہو۔ اور وہ روشنی فاسفورس کی ہو۔ خطرہ ہے۔"

"ہش تم نہ جاؤ۔ میں جاتا ہوں۔"

یوسف آگے بڑھ گیا۔ رشید مجبوراً اُس کے پیچھے ہولیا۔ رشید ایک ایک قدم سنبھال کر اٹھاتا تھا اور ہر قدم پر کہتا جاتا تھا۔

"یوسف! آگے یقینی طور پر دلدل ہے۔ ہوشیار"

لیکن یوسف برابر بڑھتا جارہا تھا۔ آخر وہ ایک جھونپڑی کے دروازے پر پہنچا۔ دروازے پر گھاس کی ٹٹی لگی ہوئی تھی جس سے چھن چھن کر معمولی سی روشنی آرہی تھی۔ یوسف نے پکارا۔

"کوئی اندر ہے"

آواز سنتے ہی ایک بوڑھا ہاتھ میں ٹین کا دیا

لیئے ہوئے دروازے پر آیا۔ بوڑھا کمر سے جھکا ہوا تھا۔ اور لاٹھی کے سہارے دروازے تک آسکا تھا۔ بوڑھے نے آتے ہی پوچھا۔

"آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟"

یوسف نے جواب دیا۔

"رات کو ٹھہرنا اور ہوسکے تو کچھ کھانا۔"

بوڑھے نے ٹٹی دروازے سے ہٹائی اور دونوں کو اندر لے گیا۔ ایک لمبی دالان تھی، جس میں سا بے کی معمولی کھٹیا بچھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں ڈیوٹ دھرا تھا۔ بوڑھے نے دیا اس پر رکھ دیا۔ اور خود اندر چلا گیا۔ اور پکارنے لگا۔

"چمپا! ارے چمپا!!"۔

نیند کی ماتی ایک آواز آئی۔

"ہاں بابو۔"

"ارے اُٹھ مہمان آئے ہیں۔ کچھ کھانے کو ہے؟"

ایک لمحے میں بوڑھا پھر ایک چٹائی لیے ہوئے دالان میں آیا۔ اور اُس کو بچھاتے ہوئے بولا۔

"بڑی مہربانی آپ کی بابو جی جو اس غریب کو نوازا۔"

یوسف نے گھبرا کر پوچھا۔

"بوڑھے بابا! اچھا یہ تو بتاؤ۔ ہم شہر سے کتنی

دُور پر ہیں ؟"

بوڑھے نے عجیب انداز سے دونوں کو دیکھا پھر بولا "

" دور کیا بابو جی ۔ یہ ہی کوئی چار کوس پر ہیں"۔
رشید نے اطمینان کا سانس لے کر کہا ۔
" ہاں تو ہم سویرے ہی وہاں پہنچ جائیں گے ۔
اگر سویرے اٹھ جائیں تو آٹھ بجے تک ہی "۔
بوڑھے نے کہا ۔
"نہیں بابو جی ۔ بڑے بھاگ سے مہمان گھر پہ آتا ہے ۔ ہم آپ لوگ کو بغیر کچھ کھائے پیے جانے نہ دیں گے"۔
رشید اور یوسف دونوں بوڑھے کی سادگی پر مسکرائے ۔ بوڑھا ایک طرف بیٹھ گیا اور بولا ۔
" ارے بیٹی ذرا پانی تو لا ۔ وہ مہمان ہیں"۔ پھر مہمانوں سے مخاطب ہوکر بولا "۔ آج میرا بیٹا شہر گیا ہے ۔ کل آجائے گا ۔ ذرا اس سے بھی مل لو ۔ بابو جی ۔ سویرے ہی آجائیگا وہ"۔
اتنے میں ایک جوان لڑکی دو لوٹوں میں پانی لیکر آئی ۔ اور چٹائی کے پاس رکھ کر چلی گئی ۔ بوڑھے نے کہا ۔
" یہ میری پوتی ہے بابو جی ۔ اس کا پتی سپاہی تھا

ایک دھاوے میں وہ مارا گیا۔ بابوجی ہم نے پاپ کیا تھا۔
اُس کا پرائسچت اسے کرنا پڑا ــــــ اچھا ہاتھ منہ دھولو بابوجی!"
رشید اور یوسف دونوں نے بوڑھے کو دیکھا
اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اُس کے جھُری سے بھرے
چہرے پر بہہ نکلے تھے۔ دونوں کو بے حد تعجب ہوا مگر کچھ پوچھنے
کی ہمّت نہ ہوئی۔ دونوں نے ہاتھ منہ دھویا اور چٹائی پر
بیٹھ گئے۔ اتنی دیر میں وہ لڑکی دو بڑے بڑے پیالوں میں
دودھ' ایک تھالی میں بھات اور ایک برتن میں گڑ چٹائی
پر رکھ کر چلی گئی۔ بوڑھے نے کہا۔

"کھائیے بابوجی!"

دونوں نے کھانا شروع کیا۔ انھیں چٹائی پر
بیٹھ کر کھاتے ہوئے تکلیف ہو رہی تھی۔ بوڑھے نے اس کو سمجھا
اور بولا۔

"ہاں بابوجی غریب کا گھر ہے تکلیف ہو تو
معاف کر دینا۔"

رشید ہنس دیا۔ یوسف نے کہا۔
"ایک بات پوچھوں بوڑھے بابا۔ بُرا تو نہ مانوگے؟"
بوڑھے نے مُسکرا کر جواب دیا۔

"مہمان کی بات کا بھی کوئی بُرا مانتا ہے۔ بابوجی"۔
یوسف نے ہنستے ہوئے کہا۔
"نہیں نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں یہ
پوچھنا چاہتا تھا۔ تمہارا کیا پاپ تھا؟ جس کا پرائسچت تمہاری
پوتی کو کرنا پڑا؟"
بوڑھے کی آنکھیں ٹمٹمانے لگیں۔ اور وہ بولا۔
پچھلی بڑی لڑائی میں ہم گئے تھے بابوجی۔ ہم
سپاہی تھے۔ ہم نے وہاں سولہ آدمی کو اپنی بندوق سے مارا۔
آدمی کا مارنا کتنا بڑا پاپ ہے بابوجی۔ بتائیے کتنی عورتوں کا
سہاگ ہم نے لوٹ لیا۔ کتنے بچوں کا دل دکھایا۔ کس کس
کی آہ ہم نے لی بابوجی۔ اُسی پاپ کا پھل اب ہم بھوگ رہے
ہیں۔ اپنی اکلوتی پوتی کو جوانی میں روتے کڑھتے ہم اپنی آنکھ
سے دیکھ رہے ہیں"۔
بوڑھے کی آواز حلق ہی میں پھنس کر رہ گئی۔
رشید اور یوسف دونوں چپ رہ گئے۔ کھانا کسی طرح ختم ہوا۔
دونوں ہاتھ دھونے باہر نکلے۔ اتنی دیر میں چمپا ایک اور کٹھیا
دالان میں رکھ کر چلی گئی۔
رات زیادہ آچکی تھی۔ دونوں تھکے ہوئے تھے

بوڑھے نے کہا۔
"آپ لوگ آرام کیجیے۔ تھکے ہوئے بھی ہیں"
اتنا کہہ کر بوڑھا گھر میں چلا گیا۔

صبح سویرے رشید کی آنکھ کھلی۔ آسمان پر
اب بھی بادل چھایا ہوا تھا۔ اس کے کانوں میں بڑی سریلی
آواز آئی۔ اور اس کے ساتھ ہی چکی کی گھرر گھرر۔ فوراً ہی
وہ سمجھ گیا۔ کہ یہ آواز کس کی ہو سکتی ہے؟ اُس نے سوچا کہ
بوڑھا ابھی سو رہا ہوگا۔ یوسف کو اٹھا کر اُس سے رائے لے
اگر رائے ہو تو چپ چاپ روانہ ہو جائے۔ اُس نے یوسف
کو اٹھایا۔ باتیں کیں۔ دونوں نے اپنی بندوقیں اٹھائیں اور چل
نکلے۔ روشنی میں معلوم ہوا کہ دروازے سے چند ہی قدم پر
ایک بڑا سا تالاب ہے۔ جس کے کنارے پر گول گول درخت
ہیں۔ بوڑھا سامنے ہی ڈورے سے مچھلی نکال رہا تھا اُس
نے دونوں کو دیکھ لیا۔ اور ہنستے ہوئے بولا۔
"دیکھیے بابو جی ہم نے آپ لوگوں کے لیے
مچھلی نکالی ہے۔ چمپا چکی پیس رہی ہے"
بوڑھے کی بات سن کر دونوں شرما گئے۔ یوسف

بوڑھے کے پاس آکر کہا۔
"بوڑھے بابا اب ہم لوگوں کو چھٹی دو۔ ضروری
کام ہے"
بوڑھے کے چہرے سے ہنسی غائب ہوگئی۔
اس کی جگہ اُداسی نے لے لی۔ وہ بولا۔
"بابوجی! چمپا کو بڑا رنج ہوگا۔ بے کھائے
پئیے مہمان گھر سے چلا جائے یہ تو بڑی بُری بات ہے"
رشید بولا۔
"ہم لوگوں کو ضروری کام ہے"
بوڑھے نے رونی صورت بنا کر کہا۔
"بابوجی ہمارا زور ہی کیا ہے۔ ہم تو آپ
سے کچھ کھا پی کر جانے کی پرارتھنا کریں گے۔ ماننا نہ ماننا
آپ کے اختیار میں ہے"
جملہ پورا کرتے کرتے بوڑھے کا چہرہ میلا پڑگیا
اس کی نظر زمین میں گڑ گئی۔ دونوں نے اس کو دیکھا اور
چپ رہے۔ بوڑھے نے ایک بڑی سی مچھلی تالاب سے
نکالی تھی۔ اسے اٹھایا۔ ڈور سنبھالی۔ پھر بولا۔
"تو بابوجی کیا فیصلہ کیا۔ آپ لوگوں نے"

یوسف نے فوراً ہی جواب دیا۔

"نہیں بوڑھے بابا! ہم تمھارا دل توڑ کر جانا نہیں چاہتے۔ تمھارا ہم پر احسان ہے"

"احسان کیا بابو جی! یہ تو ایشور نے آپ لوگوں کو بھیج دیا۔ نہیں تو کہاں گنگو تیلی اور کہاں راجہ بھوج"

رشید اور یوسف دونوں ہی ہنس پڑے۔

بوڑھا آگے آگے چلا۔ اس کے پیچھے پیچھے یہ دونوں۔ بوڑھا گھر کے اندر چلا گیا۔ یہ دونوں باہر کے دالان میں تھے کہ آواز آئی۔

"بابو مہمان دونوں کہاں چلے گئے"

"بیٹی وہ دونوں ذرا ٹہلنے گئے تھے۔ روٹی اور مچھلی جلدی پکا"

رشید اور یوسف نے دونوں کی باتیں سنیں اور شرما گئے۔ اس کے ساتھ ہی یوسف نے رشید سے کہا۔

"یار پروفیسر۔ اب چاہے تیرا جتنا نقصان ہو لیکن اب تو بھر پیٹ کھا کر جائیں گے"

رشید نے بھی "ہاں" کہی۔ اتنے ہی میں بوڑھا آگیا۔ اور بولا۔

"آئیے بابوجی، ہم آپ کو اپنی پھلواری دکھائیں۔"

دونوں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ یوسف نے وہ پگڈنڈی رشید کو دکھائی، جس پر وہ رات کو چل کر دروازے تک پہنچے تھے۔ دونوں کو جلد ہی اس کا اندازہ ہوگیا۔ کہ اگر ذرا بھی قدم اِدھر اُدھر پڑتا تو دونوں تالاب میں گرتے یا پھر بوڑھے کی پھلواری کے چاروں طرف پھیلائے ہوئے کانٹوں میں الجھتے لیکن دروازے تک پہنچ گئے۔ اس کٹھن راستے کا اندازہ کرکے دونوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ بوڑھے کی پھلواری چھوٹی تھی۔ لیکن ہر چیز قرینے سے لگی ہوئی پھلواری کے اندر کوئی عجیب و غریب اور نایاب چیز نہ تھی۔ لیکن بوڑھا ہنس ہنس کر اور لطف لے لے کر ہر چیز کو اس طرح دکھا رہا تھا، جیسے اس ہی کی ہر چیز نایاب ہے۔ دیر تک وہ گھماتا رہا۔ پھر بوڑھا دونوں کو تالاب کی طرف لے گیا۔ اور انھیں بتایا کہ وہ ہر سال

اس تالاب میں مچھلی کا بچہ منگوا کر چھوڑتا ہے۔ اور وقت آنے پر تالاب کی مچھلیوں کو بیچ دیتا ہے۔ وہی چھوٹی سی پھلواری، تالاب اور چار بیگھہ کھیت اور جھونپڑی اس کی ساری پونجی ہے۔ اور اسی میں ان تینوں کا گذارہ بڑے مزے میں ہوتا ہے۔

بوڑھا دونوں کو پھر مکان میں لے آیا۔ دالان میں بٹھا کر خود اندر گیا اور واپس آیا۔ ابھی ناشتہ تیار نہ ہوا تھا۔ بوڑھا چٹائی پر بیٹھ گیا۔ یہ دونوں بھی بیٹھے رہے بوڑھے نے ہنس کر کہا۔

"ایک بات پوچھیں بابوجی۔ برا تو نہ مانوگے؟"

یوسف نے کہا۔

"نہیں، نہیں، پوچھو بوڑھے بابا۔"

رشید کے چہرے پر سنجیدگی چھاگئی۔ اس کا دماغ برابر کام کر رہا تھا۔ اس نے بوڑھے کو غور سے دیکھا۔ بوڑھے نے پوچھا۔

"بابوجی آپ لوگ شہر میں کیا کام کرتے ہیں؟"

یوسف نے کہا :-

"میری تو دواؤں کی دوکان ہے۔ ہم دوا

بناتے ہیں۔"

بوڑھے نے خوش ہو کر کہا ——— :-

"یہ تو بڑا اچھا کام ہے بابو جی ۔ آدمی کی بھلائی کا کام ہے ۔ اور یہ بابو جی کیا کرتے ہیں؟"

یوسف نے کہا ۔

"یہ بابو جی بڑے آدمی ہیں ۔ کالج میں سائنس کے پروفیسر ہیں ۔ لڑکوں کو پڑھاتے ہیں ۔ اور آج کل تو اتنا بڑا کام کر رہے ہیں کہ اس کو پورا کرتے ہی ساری دنیا میں ان کا نام ہو جائے گا ۔"

بوڑھے نے محبت اور عقیدت بھری نگاہوں سے رشید کو دیکھا ۔ پھر یوسف سے بولا ۔

"وہ کون سا کام ہے بابو جی ؟"

یوسف نے اسی جوش کے ساتھ کہا ۔

"ہاں بوڑھے بابا تم تو لڑائی میں جا چکے ہو تم نے اس کا نام سنا ہوگا ۔ زہریلی گیس کا ۔ زہریلی گیس تو دوسروں نے بھی بنائی ہے ۔ مگر یہ ایسی گیس بنا رہے ہیں ۔ جس میں ایک گھنٹے میں لاکھوں آدمی مر سکتے ہیں ۔ ایک دن میں سیکڑوں کوس دور سے دشمن کا ناس کر دیا

جا سکتا ہے۔"

بوڑھے کے چہرے سے خوشی کی ساری نشانی مٹ گئی۔ اس کی جگہ گہری اداسی نے لے لی۔ وہ کچھ سوچنے لگا۔ یوسف نے پوچھا۔

"کیا سوچتے ہو بوڑھے بابا؟"

بوڑھا بولا۔

"یہ تو کوئی اچھا کام نہیں ہوا بابو جی۔ آدمی کو مارنے کا سامان آدمی کرے۔"

اتنے میں چمپا دو تھالیاں ہاتھ میں لیتے ہوئے آئی۔ چٹائی پر رکھ کر اندر والے دروازے کے پیچھے بیٹھ گئی رشید اور یوسف نے روٹی اور مچھلی کھانی شروع کی۔ گرم گرم مچھلی اور روٹی کھانے میں دونوں کو بڑا مزا آیا۔ دونوں نے پیٹ بھر کر کھایا اور وہاں سے رخصت ہوئے۔ لیکن بوڑھے کے چہرے سے خوشی ایسی غائب ہوئی کہ پھر نہ آئی وہ حسرت و ناامیدی اور تکلیف بھری نظروں سے رشید کو دیکھتا رہا۔

رشید راستہ بھر بوڑھے کی باتوں پر سوچتا ہوا آیا۔ کالج پہنچا۔ لیکن اس کے دماغ سے بوڑھے کی باتیں

نہ نکلیں۔ وہ الجھن میں برابر گرفتار رہا۔ آخر وہ اپنا تجربہ کرنے بیٹھ گیا۔ ساتھ ہی اُسے بوڑھے کی اُداس اور غمگین صورت یاد آئی۔ رشید دیوانہ سا ہوگیا۔ اس نے تجربہ کرنا چھوڑ دیا اور ہمیشہ کے لیے اس ارادے سے باز آنے کا فیصلہ کرلیا اس وقت اس نے محسوس کیا۔ کہ بوڑھا اندھیری رات میں اسے روشنی دکھا رہا ہے۔ مگر یہ پل بھر میں مٹ گیا اور وہ ٹھیک پہلے جوش اور انہماک کے ساتھ تجربے میں مصروف ہوگیا۔
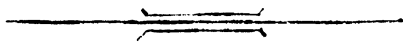
دل کا روگ

چمپا نگر سینی ٹوریم سسکتی ہوئی روحوں کی بستی۔ لرزتی ہوئی زندگیوں کی دنیا۔ مضطرب اور جھلملاتی ہوئی شمعوں کی انجمن۔ پُرفضا مقام، شاداب درختوں کے جھنڈ میں لمبا چوڑا میدان، میدان میں سبز گھاس کا نظر فریب فرش۔ اُن میں لال رنگ کی صاف سڑکیں۔ خوب صورت عمارتیں۔ لیکن اُن پر گہری اُداسی چھائی ہوئی۔ جیسے قبرستان کا بھیانک سناٹا۔

شام کے پانچ بجے سینی ٹوریم کی گھنٹی بجی، مرجھائی ہوئی زندگیوں نے کروٹ لی۔ جن مریضوں کو شام کے وقت ٹہلنے کی ہدایت تھی، وہ اپنے اپنے وارڈوں سے نکلے اور جدھر دل چاہا ٹہلنے چلے گئے۔ ایک نوجوان ریشمی قمیص اور اُونی سوئیٹر پہنے اپنے وارڈ سے نکلا اور آہستہ آہستہ

زنانہ وارڈ کی طرف روانہ ہوا۔ اُس کی مضمحل جوانی سے تو اتنا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کبھی طاقت ور اور خوب صورت نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر اُداسی اور گہری سنجیدگی تھی، وہ سر جھکائے ہوئے جا رہا تھا جیسے کسی گہرے سوچ میں ہو۔

نوجوان جیسے ہی زنانہ وارڈ کے پاس پہنچا ایک نوجوان لڑکی نے اُس کا استقبال کرتے ہوئے مسکرا کر کہا

"کیا سوچ رہے ہو چندر؟"

چندر نے چونک کر سر اٹھایا اور ذرا کھسیانا سا ہو کر بولا۔

"تمھارے ہی پاس آ رہا تھا۔"

لڑکی ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولی۔

"کہاں کھوئے ہوئے ہو؟"

چندر نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا

"نہیں تو۔"

لڑکی بولی۔

"شاید تم کچھ سوچ رہے تھے چندر ـــــ!"

"ہاں" چندر نے جواب دیا۔ "سوچ رہا تھا

کہ اس اُداس اور بے مزہ زندگی کا کیا فائدہ؟ شیاما تمھیں بتاؤ کہ اِس زندگی میں کون سی دل چسپی باقی رہ گئی ہے، جو اس کی حفاظت کے لیے زندگی کو موت سے بدتر بنایا جارہا ہے؟"

چندر چپ ہوگیا، اُس نے جواب کے انتظار میں اپنی نظریں شیاما کے ہونٹوں پر جمادیں۔ جیسے وہ جلد سے جلد جواب چاہتا تھا۔

شیاما کی عمر سترہ سال ہوگی۔ اُس کا پھیکا سفید چہرہ، حلقوں میں گھری ہوئی بڑی بڑی آنکھیں، پتلے ہونٹ اور مُرجھائی ہوئی جوانی کو دیکھ کر آدمی آسانی کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ وہ بھی کبھی خوب صورت ہوگی۔ اب بھی اُس کے چہرے پر حسن کا عکس اِس طرح موجود تھا جیسے خزاں زدہ گلشن میں بہار کی پراگندہ کیفیتیں۔

دونوں آہستہ آہستہ آگے بڑھے، چند قدم چل کر شیاما بولی "کدھر چلو گے چندر؟"

"وہ سامنے ٹیکری پر۔" چندر نے اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

دونوں اُسی طرف بڑھے۔ سامنے ٹکری کا

منظر نہایت ہی خوش نما تھا، اونچی زمین پر ہرے بھرے درختوں کا ایک قدرتی باغ سا تھا جس کے تین طرف ایک چھوٹی سی ندی بہتی تھی ندی کے کنارے پر ایک قسم کی لمبی لمبی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ جس میں پیلے پیلے پھول کھلے ہوئے تھے۔ شیاما نے کہا۔

"چندر! آج سردی کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے"

"ہاں" چندر نے جواب دیا۔

شیاما نے اپنی شال کو ذرا سنبھال کر بدن پر ڈال لیا۔ دونوں آگے بڑھتے گئے، ہر طرف جنگلی جھاڑیاں تھیں بیچ میں تنگ راستے پر دونوں سنبھال سنبھال کر قدم بڑھاتے تھے۔ جھاڑیوں میں سے کبھی کبھی تیترا اور چکور کے بولنے کی آواز آجاتی تھی۔ دونوں چپ تھے، راستے میں ایک پُر فضا جگہ دیکھ کر دونوں بیٹھ گئے۔ اُن کے چاروں طرف ہری ہری جھاڑیاں تھیں۔ اور جنگلی پھولوں کی خوشبو۔ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ اور اس طرح جیسے ایک کی دوسرے کو خبر نہ ہو۔ دونوں باتیں کرنا چاہتے تھے مگر چپ تھے۔ آخر چندر نے کہا۔

"شیاما! میں کئی دن سے سوچ رہا ہوں کہ

میری اس بے لطف زندگی کا کیا فائدہ ؟ کس لیے
اس کی حفاظت کروں ؟ صرف سینکڑوں روپے سینی ٹوریم کو
دینے کے لیے ؟ یہی روپے میرے عزیزوں کے کام آسکتے
ہیں ۔ میں تو اس بے کیف زندگی سے اُکتا گیا ہوں ۔

شیاما نے کہا ۔

"چندر ! تم کیا کہہ رہے ہو ؟ یہ بیکار باتیں ہیں
جلد ہی اچھے ہوجاؤ گے ' پھر دنیا کی ساری خوشیاں تمہارے
قدموں میں ہوں گی ——"

چندر نے کہا ۔

"میں بچہ نہیں ہوں شیاما ' تم بہلانا چاہتی
ہو ۔ میں سچ کہتا ہوں ' سارا دن مسہری میں پڑے رہنا تاش
کھیلنا اور کھانا پینا یہ کوئی زندگی ہے ؟ سچ کہتا ہوں میں اب
اس زندگی سے جلد ہی چھٹکارا پانا چاہتا ہوں ۔"

شیاما نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا ۔

"یہ بالکل بیکار باتیں ہیں چندر ۔ بلکہ مردوں
کی شان کے خلاف ۔ خوف ناک خطروں کا مقابلہ کرنا ہی ——
مردوں کا کام ہے ۔ ساری فضا مصیبتوں اور تکلیفوں سے
بھری ہوئی ہے لیکن اس سے ڈر کر جان دے دینا تو بزدلی

ہے۔ مردانگی تو یہ ہے کہ تمام مصیبتوں اور تکلیفوں میں گھر کر آدمی قہقہے لگائے جیسے بہادر سپاہی میدانِ جنگ میں جان دیتا ہے، جانتا ہے کہ موت سر پہ منڈلا رہی ہے مگر پھر بھی لاشوں کے ڈھیر پہ کھڑا ہو کر ہنستا ہے ہر قدم آگے بڑھتا ہے اور اسی طرح ہنستا اور قہقہے لگاتا ہوا خود بھی مر جاتا ہے۔۔۔۔"

چندر نے بات کاٹ کر کہا۔

"ہر آدمی کا خیال اپنے مشاہدات اور حسیات کے ماتحت بنتا ہے، تم اتنی دلیر ہو، لیکن میں نہیں ہوں۔ اب مجھ سے روز روز خون تھوکا نہیں جا سکتا۔ علاج ہو رہا ہے مگر دل کا روگ ہر روز بڑھتا ہی جاتا ہے، اس سے جلد ہی چھٹکارا پانا ضروری ہے۔ میری زندگی عذاب بن چکی ہے۔ تم کسی دن سن لو گی کہ میں نے خودکشی کر لی۔"

تھوڑی دیر تک چندر یاس کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا باتیں کرتا رہا اور پشپا ماما اسے تسلی دیتی رہی لیکن جب اس کی حسین آنکھوں میں آنسو پیدا ہونے لگے تو اس نے کہا۔

"چندر اب چلنا چاہیے شام ہو رہی ہے۔"

وہ اٹھ کھڑی، چندر بھی اٹھا، دونوں سینی ٹوریم کی طرف چلے، آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ پورب میں تاریکی اور پچھم میں ہلکی سی سرخی پھیلتی جا رہی تھی۔

(۲)

چندر اور شیاما ایک ہی شہر کے رہنے والے تھے۔ ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے، دونوں کے باپ شہر کے مشہور وکیل اور گہرے دوست تھے، بچپن سے ایک دوسرے کے گھر آیا جایا کرتے تھے، کسی قسم کی غیریت نہیں تھی۔ مگر دونوں شرمیلے تھے۔

شیاما نے ایف۔ اے پاس کیا تو اُس کے باپ نے ایک جگہ اُس کے بیاہ کی بات پکی کر لی۔ لڑکا وکیل تھا، گھر بھی اچھا تھا، اُس کے باپ کو بڑی خوشی تھی لیکن شیاما اس خبر کو سنتے ہی بدحواس سی ہو گئی۔ وہ سوچتے سوچتے تھک گئی۔ آخر وہ سیدھی چندر کے گھر پہنچی تاکہ ساری باتیں کہہ کر دل کا بوجھ ہلکا کرے مگر چندر گھر پر نہ تھا دوسرے دن شیاما پھر شام کے وقت چندر کے گھر آئی۔ چندر اس وقت باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ آئینے

کے سامنے کھڑا بال سنوار رہا تھا۔ شیاما آکر کھڑی ہوگئی آئینے میں چندر نے اُس کا عکس دیکھ لیا۔ لیکن خاموش رہا پہلے چندر تپاک سے اُس کا استقبال کیا کرتا تھا۔ فوراً باتیں شروع کردیتا تھا، لیکن آج اُس نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا شیاما کو سخت حیرت تھی چندر خاموشی سے بال سنوارتا رہا۔

شیاما نے کہا "چندر! میں آئی ہوں۔"

چندر نے بے پروائی کے ساتھ کنگھی پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہوں"

شیاما نے کہا۔

"میں کل بھی آئی تھی چندر ——"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔ ماتا جی نے بتایا تھا"

چندر نے جواب دیا۔

بال سنوارنے کے بعد چندر غسل خانے میں گھس گیا۔ شیاما ایک کرسی کے سہارے کھڑی رہی۔ غسل خانے میں جانے کا کیا مطلب۔ آج اُس کے تیور بالکل بدلے ہوئے ہیں۔ پہلے وہ آتی تھی تو اُسے دیکھ کر وہ پھول کی طرح کھل جاتا تھا۔ کبھی اپنے مضامین سناتا کبھی کسی

بڑے مصنف کی تصنیف پر بحث چھیڑ دیتا۔ ایک دن چندر نے خود ہی فلسفہ محبت پر بحث چھیڑ دی تھی اور اس کے بحث میں حصہ نہ لینے پر بھی بحث کو خود ہی بڑھاتا جاتا تھا اور آخر کہنے لگا۔

"شیاما میں ایک ناول لکھنا چاہتا ہوں جس میں محبت کے فلسفے پر ایسی بحث کرنا چاہتا ہوں کہ کسی مصنف نے نہ کی ہو" اس کا جواب اُس نے دیا۔

"تو پھر وہ فلسفے کی کتاب ہو گی، ناول نہیں"

اس پر ایک دوسری بحث چھڑ گئی

غسل خانے سے پانی بہنے کی آواز برابر آ رہی تھی، گنگناکر شیاما نے چاہا کہ آگے جاکر آواز دے۔ آگے بڑھی تو میز پر ایک لفافہ پڑا ملا۔ یہ چندر کے باپ کا خط تھا، شیاما نے اٹھا لیا۔

"چندر! تمھارے بیاہ کی بات شام بابو کی بیٹی سے ہو رہی ہے، سمجھو کہ پکی ہو چکی ہے، صرف تمھاری ہاں کی دیر ہے۔ تمھیں اس مسئلے میں کامل آزادی دیتا ہوں، لڑکی کو تم خود بھی جانتے ہو یقین ہے کہ تم اس بات کو ناپسند نہ کرو گے"

شیاما نے خط کو پڑھنے کے بعد لفافے میں بند کرکے اُسی طرح رکھ دیا اور اپنی جگہ واپس آگئی، چندر تولیہ سے منھ ہاتھ صاف کرتا ہوا غسل خانے سے نکلا اس کے چہرے پر اداسی تھی اور آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک چندر نے کوشش کرکے اپنی نظروں کو شیاما کی طرف سے پھیرے رکھا اُس کی طرف ذرا بھی متوجہ نہ ہوا، شیاما بولی۔

"چندر! میں کل بھی آئی تھی۔"

"ہاں ماتا جی سے معلوم ہوا تھا۔" چندر نے جواب دیا۔

شیاما پھر چپ ہوگئی، سوچنے لگی، اب کیا کہوں دیر تک یہی سوچتی رہی مگر اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا تو جی کڑا کرکے بولی۔

"چندر — میرا بیاہ ہونے والا ہے۔"

چندر نے اسی بے پروائی کے ساتھ جواب دیا۔

"مجھے معلوم ہے۔"

شیاما کو ایسے روکھے جواب کی امید نہ تھی۔ وہ بِگڑا سی گئی۔ اس کو یقین ہوگیا، کہ چندر اپنی بیاہ کی خوشی میں پھولا نہیں سماتا۔ شام بابو دولت مند آدمی ہیں

اُن کی بیٹی سبھدرا خوب صورت اور پڑھی لکھی ہے۔ پسند نہ ہونے کی کوئی وجہ ہی نہیں، تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگی:

"اور سبھدرا دیوی کب آئیں گی؟"

"کبھی آ ہی جائے گی"

چندر نے جواب دیا، شیاما کے دل پر چوٹ سی لگی، اُس کو ایسے جواب کی ہرگز امید نہ تھی وہ تلملا سی گئی۔

"تو میں جا رہی ہوں چندر ——"

شیاما کے دل کو ایک جھٹکا سا لگا، وہ واپس جانے کے لیے پلٹی، لیکن دروازے کے پاس آکر پھر وہ رُک گئی، چندر ٹینس ریکٹ ہاتھ میں لیے اُس کے پاس سے کترا کر باہر چلا گیا۔ اُس کی طرف دیکھا تک نہیں۔

شیاما کا دل بیٹھ گیا، سر چکرانے لگا، قریب تھا کہ بے ہوش ہو کر گر پڑے، مگر کوشش کرکے اُس نے اپنے کو سنبھالا۔ مہینوں سے اپنے بیاہ کے متعلق سن سن کر اُس کا دل اور دماغ بے قابو ہو رہا تھا چندر کے جواب نے اُس پر آخری اور بھاری چوٹ لگائی۔

دوسرے ہی دن معلوم ہوا کہ شیاما کو سخت بخار ہے۔ بیاہ کے تھوڑے ہی دن باقی تھے، تاریخ بڑھ

گئی مگر شیاما اچھی نہ ہوئی، بخار برابر رہنے لگا مسلسل چار مہینے بخار میں مبتلا رہنے کے بعد ڈاکٹروں نے دق تجویز کی اور اُن کی ہدایت سے وہ سینی ٹوریم بھیجدی گئی۔

چندر کی زندگی بالکل بدل چکی تھی، زیادہ تر وہ اپنے کمرے ہی میں رہتا، شیاما کے گھر اور اُس کے ماں باپ سے تو اُس کو نفرت ہوگئی تھی، شیاما چار مہینے تک بخار میں جلتی رہی، لیکن وہ اُس کو دیکھنے کے لیے بھی نہ گیا، پہلے اگر اُس کو معمولی سا بخار بھی ہوجاتا تھا، تو دن میں چار مرتبہ اُس کو دیکھنے جایا کرتا تھا۔ اُس کی ماں برابر کہتی کہ جاکر دیکھ آؤ، مگر چندر نہ گیا، شیاما کے گھر والوں کو بھی حیرت تھی کہ چندر کیوں نہیں آتا۔

جس دن شیاما سینی ٹوریم جارہی تھی، سب جانے پہچانے لوگ اُس کو رخصت کرنے آئے، لیکن چندر نہ گیا، چندر کی زندگی میں ایسی تبدیلی دیکھ کر اُس کی ماں بہت گھبرائی وہ ہزار پوچھتی کہ بات کیا ہے مگر وہ کچھ بھی جواب نہ دیتا۔

شیاما کے چلے جانے کے چند دنوں بعد چندر کے منہ سے بھی یکایک خون آگیا، ڈاکٹروں نے دق تجویز

کی اور کہا کہ مرض پرانا ہے، علاج نہیں ہوا، اس لیے بڑھ گیا۔ مگر علاج ہوتا کیسے کسی کو معلوم ہی نہ تھا کہ چندر بیمار ہے۔ چندر نے کسی سے کچھ کہا ہی نہیں اُس کو سخت بخار ہوتا تو ہاتھ میں ٹینس ریکٹ لے کر باہر چلا جاتا، طبیعت اچھی رہتی تو کھانا کھا لیتا، ورنہ کہہ دیتا کہ ہوٹل میں زیادہ ناشتہ کر لیا ہے، سوائے کمرے میں بیٹھے رہنے کے اور کوئی بات اُس نے ظاہر نہ ہونے دی، جب ماں کمرے میں آتی تو کوئی کتاب پڑھنے لگتا۔ کچھ پوچھتی تو کہہ دیتا کہ کچھ اچھی کتابیں مل گئی ہیں۔ ختم کر کے جلد ہی واپس کر دینا ہے۔ وہ اُس کے شوق کو جانتی تھی، اُس کا جواب سُن کر چپ ہو جاتی۔

منھ سے خون آیا تو مرض کا پتہ چلا۔ اور چندر بھی سینوٹوریم بھیج دیا گیا۔

(۴)

دوسرے دن پھر چندر اپنے وارڈ سے نکلا شیاما پہلے ہی سے اُس کا انتظار کر رہی تھی، دونوں پھر ٹیکری کی طرف روانہ ہوئے۔ شیاما چندر کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی نظریں چندر کے دل کی انتہائی گہرائیوں میں ڈال کر دیکھنا

چاہتی تھی کہ وہاں کیا ہے۔ آخر شیاما نے پوچھا۔

"چندر! سبھدرا کی کیا خبر ہے؟"

اُس کے اندازِ گفتگو میں طنز تھا، سبھدرا کی شادی ہو چکی تھی، چندر نے جواب دیا۔

"جہنم میں گئی"

شیاما کو اُس کے جواب سے خوشی ہوئی وہ کچھ اور بولتی مگر چندر کے جواب سے لطف اٹھانے لگی۔

چندر نے اُس کے اس سوال کو طنز سمجھا، چندر نے کہا،

"مسٹر مراری لال کس حال میں ہیں؟"

"سبھدرا کے ساتھ وہ بھی گئے"

سبھدرا کی شادی مراری لال سے ہو گئی تھی، پہلے مراری لال کے بیاہ کی بات شیاما سے ہوئی تھی مگر دق کے مرض نے بات ختم کر دی، چندر بھی بیمار ہو گیا، آخر قسمت نے مراری لال کو شیاما کسے اور سبھدرا کو چندر سے چھین کر ملا دیا۔

کچھ دور جانے کے بعد شیاما نے کہا۔

"میں تھک گئی ہوں چندر بیٹھ جاؤ۔"

دونوں ایک جگہ بیٹھ گئے ۔ جنگلی جھاڑیوں پر امرلتا کی بیل پھیلی ہوئی تھی، ایک ننھی سی چڑیا اُس پر پھدکتی پھر رہی تھی ۔ چاروں طرف جنگلی پھولوں کی بھینی اور نشیلی خوشبو پھیل رہی تھی، وہاں سے ایک میل دور ایک جھرنا بہتا تھا ۔ اُس سے پانی گرنے کی آواز برابر آ رہی تھی ۔ شیاما نے کہا ۔

"چندر! آج کل میں ایک انگریزی ناول پڑھ رہی ہوں، ختم کر کے دوں گی، ضرور پڑھنا" چندر نے جواب دیا ۔

" شیاما! میں آج کل ایک ناول لکھ رہا ہوں، ختم کر کے دوں گا ضرور پڑھنا "

شیاما نے مسکرا کر کہا ۔

" وہی محبت کی فلسفے والی کتاب ہو گی تم ناول تو خواہ مخواہ لکھ رہے ہو، کیوں وہی ہے نا؟"

چندر نے کہا!" وہ نہیں شیاما! یہ صرف ناول ہو گا، ایک خونیں داستان، ایک نوجوان کی خون اور آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی کہانی، روح کی تڑپ اور دل کے زخموں کی تصویر، محبت کے الم ناک پہلو کا نفسیاتی مطالعہ، اب فلسفہ

باقی نہیں رہ سکتا، اُس میں صرف احساس ہوگا سشیاما!"

شیاما نے اُس کا چہرہ غور سے دیکھا اور کہا۔

"پلاٹ کیا ہے چندر — ؟"

چندر نے کہا "پلاٹ کیا ہوگا، وہی ایک نوجوان دوشیزہ سے محبت کرتا ہے، مگر معلوم نہیں کہ وہ دوشیزہ بھی نوجوان کو چاہتی ہے یا نہیں۔ دوشیزہ کی شادی ہونے والی ہوتی ہے، تو نوجوان افسردہ دل ہوکر اُس سے ملنا جلنا ترک کردیتا ہے، نہ جانے دوشیزہ اُس کے بارے میں کیا خیال کرتی ہے، مگر وہ بکایک بیمار ہوجاتی ہے، نوجوان بھی بیمار ہوجاتا ہے، دونوں ایک ہی مرض کے شکار ہوتے ہیں دونوں میں پھر ملاقات ہوتی ہے، آخری منزل کے قریب دونوں روز ملتے ہیں، پھر احساسات جاگ پڑتے ہیں نوجوان آخر اپنی افسردہ زندگی سے تنگ آکر خودکشی کرلیتا ہے۔"

شیاما خاموش ہوگئی۔ دیر تک دونوں چپ رہے

"ہاں پلاٹ تو اچھا ہے، لیکن نامکمل ہے، اور یہ اسی لیے کہ تم فلسفی ہو۔ کاش تم اس دوشیزہ کی آنکھوں میں محبت کے آنسوؤں کی جھلک دیکھ سکتے، تو اُس ناول کا پلاٹ مکمل ہوجاتا۔ تمھیں دیکھنا چاہیے کہ دوشیزہ بھی نوجوان

سے محبت کرتی ہے، لیکن غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ شاید نوجوان کو اُس سے محبت نہیں رہی، مگر اُس کا انجام کیا ہو؟ ایشور ہی بہتر جانتا ہے۔

چندر سناٹے میں آگیا، اُس کی نگاہیں شیاما کے مردنی چہرے پر جم گئیں، وہ کچھ بولنا چاہتا تھا، لیکن بول نہ سکتا تھا، آخر شیاما نے پوچھا۔

"بولو چندر اب کیا ہوگا ——— ؟"

"واپس چلو۔ اب وقت ہوگیا" چندر مشکل سے اتنا کہہ سکا۔

دونوں اٹھ کھڑے ہوئے، چندر کے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ وہ سر تھام کر بیٹھ گیا، کھانسی شروع ہوئی اور اُس نے خون تھوک دیا، اور دیر تک کلیجہ تھام کر تھوکتا رہا۔ شیاما گھبرا گئی، چندر کی طبیعت ذرا سنبھلی، تو بڑی مشکل سے سینی ٹوریم تک واپس آیا۔

دوسرے دن سے چندر پھر بستر پر پڑ گیا، اور اُسے ٹہلنے کی ممانعت ہوگئی، روز روز خون آنے لگا، اُس کی زندگی تیز ہوا میں جلتے ہوئے چراغ کی طرح جھلملانے لگی۔

شیاما ہر روز چندر کو دیکھنے آئی، دیر تک بیٹھ کر

اُس سے باتیں کرتی، ایک دن چندر نے اُس سے کہا، شیاما
اب میں بچ نہیں سکتا، مجھے اس کا یقین ہے۔"
شیاما نے کہا "بیکار باتیں ہیں چندر! ایشور
پر بھروسہ کرو۔"
" ایشور کی یہی مرضی ہے شیاما" چندر نے
کہا اور کروٹ بدل کر چپ ہو گیا۔
دوسری صبح معلوم ہوا کہ چندر مر چکا ہے، شیاما
اُس کو دیکھنے کے لیے ہی آ رہی تھی، کہ اُس کو یہ خبر ملی، وہ
بے ہوش ہو کر گر پڑی، سر اور سینے میں سخت چوٹ آئی،
منھ سے خون آیا اور آتا ہی رہا دیر کے بعد ہوش آیا، اُس
کے بعد ایسی غشی طاری ہوئی کہ پھر کبھی ہوش نہ آیا۔
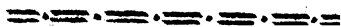
گناہ کی یادگار

رمضان کی پچیس تاریخ تھی ۔ چار بجے شام کا وقت تھا ۔ بازار میں چہل پہل تھی ۔ سارے چھوٹے بڑے عید کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے ۔ دوکانوں میں چھوٹے چھوٹے بچے اپنے باپ بھائی کے ساتھ چیزیں خرید رہے تھے ۔ ہر طرف رونق تھی ۔ روزہ داروں کے ہونٹ سوکھے مگر چہرے تازہ تھے ۔

عبدل اپنے کارخانے سے کام کرکے سیدھا بازار چلا آیا ۔ اور افطار کے لیے پھل خریدنے لگا ۔ پھل کے بازار میں بہت بھیڑ تھی ۔ اکثر دھکا سا لگ جاتا تھا ۔ اُس کے کانوں میں کسی بچے کے رونے کی آواز آئی ۔ اُس نے مڑکر دیکھا ۔ پاس ہی تین چار برس کا ایک بچہ رو رہا تھا لیکن اس کو کوئی نہ پوچھتا تھا کہ کیوں رو رہا ہے ۔ عبدل نے

کوئی بچہ نہ تھا۔ بچے پر اُس کو ترس آگیا۔ اُس کو چپ کرنے لگا لیکن وہ چپ نہ ہوا۔ اُس نے جو پھل خریدے تھے، ان میں سے کچھ اُس بچے کو دیئے مگر پھر بھی وہ چپ نہ ہوا ــــ عبدل نے پوچھا:۔

"کیوں روتے ہو؟"

بچے نے روتے ہوئے جواب دیا:۔

"گھر جائیں گے اماں کے پاس۔"

عبدل نے کہا:۔

"اچھا چپ ہوجاؤ۔ ہم پہنچا دیتے ہیں۔ بتاؤ تمھارا گھر کہاں ہے؟"

بچے نے چپ ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:۔

"گھر اماں کے پاس۔"

عبدل نے پھر پوچھا:۔

"گھر کدھر ہے ــــ کہاں ہے؟"

بچے نے اپنی ننھی ننھی ہتھیلیوں سے آنسو پونچھ کر انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا:۔

"اُدھر، اُدھر۔"

عبدل کچھ سمجھ نہ سکا۔ اس کا کہاں گھر ہے،

کس کا بچہ ہے۔ یہاں کس طرح چھوٹ گیا۔ اُس نے سمجھا
کہ ماں پھل وغیرہ خریدنے آئی ہوگی۔ یہ بھٹک گیا۔ اس کے
دل پر چوٹ سی لگی۔ ماں بے چاری اپنے بچے کے لئے کتنی
پریشان ہوگی۔ رو رہی ہوگی۔ بے چاری نہ جانے کہاں کہاں
ڈھونڈھتی پھر رہی ہوگی۔ بدحواس ہوگی۔ خدا کرے ادھر ڈھونڈتی
ہوئی آنکلے۔

عبدل کے نہ بیوی تھی اور نہ کوئی بچہ۔ مگر اس
کو یہ معلوم تھا کہ بچوں کے کھو جانے پر مائیں کیسی پگلی ہو جاتی
ہیں۔ ایک بار پانچ چھ برس کی عمر میں وہ بھی میلے میں گم ہو گیا
تھا۔ اس کی ماں چھاتی پیٹ پیٹ کر رو رہی تھی کہ وہ اتنے میں
پہنچ گیا۔ مگر پھر بھی وہ اُس کو چھاتی سے لپٹا کر رونے لگی۔
اور دیر تک روتی رہی۔ اُس کو اپنی ماں کی حالت یاد آئی
اُس کا دل پگھل گیا اور اُس نے سوچا کہ جلد سے جلد اس
بچے کو پہنچا دینا چاہیے۔

وہ اُس بچے کو لے کر چلا۔ بچہ میلے اور پھٹے ہوئے
کپڑے پہنے تھا۔ ننگے پاؤں اور ننگے سر۔ اُس کے ایک ہاتھ میں
دو کیلے تھے، اور ایک ہاتھ میں ایک، جس کو وہ کھاتا جا رہا
تھا۔ عبدل کچھ دور گیا تھا کہ ایک سپاہی آتا ہوا نظر آیا۔

پانچ بج رہے تھے۔ اور افطار کا وقت نزدیک آتا جارہا تھا۔
اُس نے سوچا کہ سپاہی کے حوالے کیوں نہ کردے۔ وہ پتہ
لگا کر پہنچا دے گا۔ شاید ہم سے پتہ نہ چلے۔ افطار کا وقت
بھی ہو رہا ہے۔ اُس نے سپاہی سے کہا:۔

"سپاہی جی یہ بچہ نہ جانے کس کا کھو گیا ہے۔"

سپاہی نے اپنا ہنٹر گھماتے ہوئے کہا:۔

"تو ہم کیا کریں؟"

عبدل بولا:۔

"آپ اس کے ماں باپ کا پتہ آسانی سے
چلا سکتے ہیں......"

سپاہی نے کہا:۔

"مار حرامی ..... کو ایک طمانچہ، بھگا دے اپنے
سے گھر پہنچ جائے گا۔"

سپاہی یہ کہہ کر منہ سے بیڑی کا دھواں اڑاتا
ہوا اپنی راہ چلا گیا۔ عبدل کو فکر ہوئی۔ اب سورج ڈوبتا جارہا
تھا۔ اور افطار کا وقت بہت قریب تھا۔ وہ سوچنے لگا۔
کیا کرے۔ بچے کو اُس کے گھر پہنچائے۔ یا اپنے گھر جا کر
افطار کرے۔ خیال ہوا۔ روزہ افطار کرنا ضروری ہے۔ یوں

بھی روزہ رکھ کر دن بھر کام کیا ہے ۔ مگر پھر خیال آیا یہ بچہ کہاں جائے گا ۔ مارا مارا پھرے گا ۔ اور اس کی ماں الگ پریشان ہو گی ۔ افطار پھلوں سے کر لینا ٹھیک ہے ۔ اور بچے کو جس طرح بھی ہو گھر پہنچا دینا ضروری ہے ۔ مگر وہ تھک کر نڈھال تھا ۔ ہمت نہ ہوتی تھی کہ بچے کو لے کر گلی گلی پوچھتا پھرے کہ کس کا بچہ ہے ۔ اُس نے سوچا کہ بچے کو پھسلا بہلا کر اپنے گھر لے جانا چاہیئے ۔ صبح کو پہنچا آئے گا ۔ مگر خود ہی اُس نے سمجھ لیا کہ یہ رائے غلط ہے ۔ بچہ روتا رہے گا ۔ نہ خود چین لے گا اور نہ چین لینے دے گا ۔ اُس نے یہی فیصلہ کیا کہ بچے کو پہلے پہنچا دیا جائے ۔

وہ بچے کو لے کر چلا ۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے بچے کی ماں کی پریشاں حالی گھوم رہی تھی ۔ وہ سوچنے لگا کہ بچے کو لے کر جب اس کے گھر پہنچے گا تو اُس کی ماں دوڑ کر بچے کو گود میں اٹھا لے گی چھاتی سے لپٹا لے گی ۔ بار بار چومے گی اور کہے گی ۔ کہاں رہ گیا تھا میرا لال ، کدھر چلا گیا تھا میرا پوت ، وہ یہی سوچتا جا رہا تھا اور مشکل سے چوتھائی میل گیا ہو گا وہ ایسے محلے میں پہنچا ، جہاں غریب مزدور رہا کرتے تھے ۔ لڑکا یکایک اچھل پڑا اور

"وہ میرا گھر' وہ گھر" کہتا ہوا تیزی سے بھاگا۔ عبدل اُس کے پیچھے تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ ابھی مغرب کا وقت نہیں ہوا تھا۔ افطار میں دیر تھی۔ وہ بچے کو دیکھتا رہا۔ بچہ ایک دروازے پر پہنچا۔ اُسی وقت ایک، عورت گھر میں سے رکابی میں کچھ لیئے نکلی۔ بچہ "ماں' ماں" کہہ کر اُس سے لپٹ گیا۔ لیکن عورت نے اُس کو دو تین طمانچے مارے۔ اور کچھ بولی بھی جس کو عبدل نہ سن سکا۔

عورت گھر میں چلی گئی۔ وہ بچہ بھی اُس کے ساتھ چلا گیا۔ عبدل کو بڑی حیرانی ہوئی۔ یہ کیسی عورت ہے کھویا ہوا بچہ ملا۔ تو معلوم ہوا کہ اُس کو کچھ بھی خوشی نہ ہوئی ذرا بھی پریشان نہ تھی۔ بلکہ اُس نے بچے کو مارنا شروع کردیا عجیب عورت تھی کم بخت۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بہت سے بچے ہیں۔ اُس کو عورت سے نفرت ہونے لگی کم بخت ہے۔ جس کے بہت سے بچے ہوتے ہیں کیا وہ چاہتی ہے کہ کوئی بچہ کھو جائے۔ یا مرجائے۔

عبدل نے راستے ہی میں روزہ افطار کیا۔ اور ایک ہوٹل میں چائے پی۔ گھر آیا اور ایک ٹاٹ بچھا کر کھلی ہوئی جگہ میں لیٹ رہا۔ اُس کے دماغ میں

ساری باتیں چکر لگانے لگیں۔

عبدل کا دنیا میں کوئی بھی نہ تھا۔ بچپن ہی میں اُس کے ماں باپ مر چکے تھے۔ ایک چچا تھا جس نے اُس کی کبھی پروا نہ کی۔ ایک بڑی بہن تھی۔ جس کا بیاہ ہو چکا تھا۔ اُسی کے ساتھ رہنے لگا۔ جب بارہ برس کا ہوا تو وہ بھی اُس کو چھوڑ کر سدھاری۔ وہ راج مستریوں کے ساتھ مزدوری کرتی تھی۔ ایک دن تین منزلے مکان کی سیڑھی سے پھسل کر گری۔ زخمی ہوئی اور تین چار دنوں تک تکلیف اٹھانے کے بعد ہسپتال میں مر گئی۔ اس کے بعد عبدل کا کوئی نہ تھا۔ کچھ دنوں اِدھر اُدھر کام کرتا رہا اور جب بڑا ہوا تو ایک سردار کی مہربانی سے کپڑے بننے کے کارخانے میں اُس کو جگہ مل گئی۔ تین چار برس وہاں کام کرتا رہا۔ دس بارہ روپیے مہینے میں مل جاتے تھے اور وہ ان کو کھا پی کر کچھ قرض بھی لے لیا کرتا تھا۔

ایک بار کارخانے میں ہڑتال ہوئی۔ یہ جیالا نوجوان تھا۔ شریک ہوا۔ اور دوسرے مزدوروں سے ہڑتال میں آگے رہا۔ مگر ہڑتال ٹوٹ گئی۔ اس کی نوکری چھوٹی

دوسرے مزدور کام کرنے لگے۔ عبدل اور اس کے تین ساتھی ستیاگرہ کرنے پر تل گئے۔ کچھ لوگوں نے مل کر اُس کو مارنا چاہا مگر تھا جیالا۔ مار کیوں کھاتا۔ لاٹھی لے کر اُن پر پل پڑا۔ سات آٹھ کو زخمی کر دیا۔ پولیس نے اس کو گرفتار کر لیا۔ اور مارپیٹ کرنے کے بعد سب کو عدالت میں پہنچا دیا۔ عدالت نے سب کچھ سنا۔ اور سب کو سزا دے دی۔ فساد کرنے کے جرم میں عبدل کو تین سال کی سزا ہوئی۔ اور کسی کو کچھ کسی کو کچھ۔

تین سال کے بعد جیل سے نکلا۔ وہاں کے کارخانوں میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ اس شہر میں چلا آیا۔ ابھی یہاں آئے ہوئے صرف دس دن ہوئے تھے بہت کم لوگوں سے اُس کی جان پہچان تھی۔ شاید ایک ہی دو آدمیوں سے۔ اس لیے وہ گھر آتا تو چپ چاپ پڑا رہتا کبھی کوئی مزدور آ کر پاس بیٹھ رہتا تو اس سے باتیں کر لیتا ورنہ نہیں۔

اس کے پاس ایک کمرہ تھا۔ جس کا ایک روپیہ مہینہ کرایہ دینا پڑتا تھا۔ یہ اُس کو بڑا جبر تھا۔ مگر کیا کرتا اور کوئی ساتھی تھا ہی نہیں کہ کمی ہوتی۔

وہ ٹاٹ پر پڑا پڑا سوچنے لگا۔ اس سال عید

کیسی کٹے گی ۔ اس شہر میں تو دوست یار بھی نہیں ۔ اکیلے عید کا کیا مزا؟ چلنا چاہیئے پہلی ہی جگہ ۔ بلا سے وہاں کام نہیں ہے دوست یار تو ہیں ۔ وہاں عید مزے میں کٹ جائے گی ۔ اگر وہاں کام مل گیا تو کیا کہنا ۔ مگر وہاں کام نہیں مل سکتا ۔

اس کو پھر اُس بچے کا خیال آیا ۔ آہ غریب بچہ کیسی ظالم ماں ہے ۔ ڈاین ہے، چڑیل ۔ مارا ہوگا کہ بھاگ گیوں گیا ۔ بھاگتا کیسے کھو گیا ہوگا ۔ جبھی تو ماں ماں کہہ کر رو رہا تھا ۔ اُس کو پھر عید کا خیال آیا اور اکیلے ہونے کا ۔ اُس نے فیصلہ کرلیا کہ پہلے شہر میں ضرور جائے گا اور عید وہیں کریگا ۔ مگر پھر اُس نے سوچا ۔ رجیا کا تو پتہ نہیں یسنا ہے اُس نے کسی سے بیاہ کرلیا اور کہیں چلی گئی لے اس کے اب وہاں کیا دھرا ہے ۔ نہیں جانا چاہیئے ۔ واہ کیسے اچھے دن تھے ۔ جب ہم دونوں چھپ چھپ کر ملتے تھے ۔ نہ جانے اس کا باپ رجب میاں کہاں چلا گیا ۔ اب وہاں کون ہے رجیا کیسے چھپ چھپ کر آتی تھی ۔ باپ سے ڈرتی تھی مگر مجھ سے محبت کرتی تھی ۔ میں نے اس سے بیاہ کرنے کا وعدہ کرلیا تھا مگر میں نے اس کے ساتھ دغا کی تھی ۔ اُس کی عزت لے لی تھی مگر کیا ہوا ۔ میں تو اس سے بیاہ کرتا ہی ۔ اور

پھر جانتا بھی کون ہے۔ کہ اُس کی عزت میں سے لوبھ ل تھی۔ اگر کسی کو معلوم ہوتا تو اُس سے کبھی بیاہ نہ کرتا۔ مجھ کو تین برس کی سزا ہوگئی۔ اسی بیچ میں اُس کا بیاہ ہوگیا۔ نہ جانے کس سے۔ بے چاری کا جی بھی اُس کے ساتھ لگتا ہوگا یا نہیں۔

عبدل کو رنجیا کی یاد نے بے چین کر دیا۔ تو اُس نے دل کو تسکین دینے کے لیے کہا۔ مگر کالی تو تھی۔ محبت کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم کو کیا دوسری عورت مل ہی نہیں سکتی۔ جلد ہی کہیں بیاہ کرلوں گا۔ لیکن پھر رنجیا کی بھری ہوئی جوانی اور اس کے اس ہی اُس کی تہمت بھری باتیں یاد آنے اور تڑپانے لگیں۔ اُس کے دماغ میں بہت سی باتیں اس طرح آنے لگیں، جس طرح اسٹیشن پر گاڑی ٹھہرتے ہی تیسرے درجے کے مسافر ڈبوں میں بھرنے لگتے ہیں۔ وہ گھبرا گیا۔ اور اُٹھ بیٹھا۔ دن بھر روزد رکھ کر کام کرنے سے تھکن زیادہ تھی۔ وہ اٹھا کہ جا کر پھر ہوٹل میں چلانے پڑے۔

اُس نے چٹائی لپیٹ کر کمرے میں بند کی۔ تالا لگا کر پاس کے ہوٹل کی طرف چلا۔ راستے میں شبراتی

اور تکّو ملے ۔ وہ دونوں اُس کے ملاقاتی تھے ۔ اور دوسرے
کارخانے میں کام کرتے تھے ۔ وہ دونوں بھی چائے پینے
کے لیئے ہوٹل جا رہے تھے ۔ باتیں ہونے لگیں ۔ شبراتی بولا
"کل ہم لوگ گھر جا رہے ہیں عید کرنے"
عبدل چپ ہو گیا ۔ وہ کہاں جاتا ۔ یا جانے
کو کہتا ۔ اس کے دل کو چوٹ سی لگی ۔ لیکن اُس نے فوراً
بات بدل دی ۔ اور شام کو جس لڑکے کو اُس نے دیکھا تھا
اس کا سارا واقعہ کہہ سنایا ۔ تکّو ذرا کڑے دل کا آدمی تھا
اُس کو عبدل کی بات پر ہنسی آ گئی ۔ بچّے کو اگر ماں نے مارا
تو اس میں بات ہی کیا ہے ؟ اُس نے کہا :۔
"بدمعاش ہو گا ۔ بے چاری بازار لے گئی
ہو گی ۔ اِدھر اُدھر بھاگ گیا ہو گا تو مارے نہیں ۔ لونڈے
سب بدمعاش ہوتے ہیں"
عبدل اس کا منھ دیکھنے لگا ۔ اُس کی بات
سمجھ میں آنے والی اور دل میں لگنے والی تھی ۔ مگر اُس
بچّے کی ماں نے جس طرح اُس کو مارا تھا ۔ اُس میں محبت
ذرا بھی نہ تھی ۔ صرف غصہ تھا ۔ عبدل نے کہا :۔
"نہیں بھائی ۔ کوئی ماں ایسے کاہے کو مارے گی

معلوم ہوتا ہے کہ سوتیلی ماں تھی۔"

کلو نے کہا:۔

"تو بھائی تم بے بال بچے کے ہو، چھٹے آزاد کیوں نہیں اُس کو مانگ لاتے اور بیٹا بنا کر پالتے۔ آخر کماتے ہو۔ کون ہے کھانے والا ــــــ؟"

عبدل کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ اگر اُس کے اپنا بیٹا ہوتا تو عید میں اُس کے کپڑے بنواتا۔ ساتھ لے کر نماز کے لیے جاتا۔ اُس کو کیسی خوشی ہوتی۔ اُس کے چہرے پر ہنسی دوڑنے لگی۔ سچ مچ اگر وہ اس بچے کو دیدے تو کیا اچھا ہو۔ دل بہلانے کا سامان ہو جائے۔ وہ ہوٹل پہنچا۔ چائے پی۔ اور واپس آیا لیکن ایک ہی خیال اُس کے دماغ میں گھومتا رہا۔

صبح کے وقت عبدل کارخانے چلا۔ راستہ وہی تھا، جہاں بچے کا گھر تھا۔ عبدل کچھ سوچتا ہوا چلا جارہا تھا۔ بچے نے اُس کو دیکھا اور آکر اس سے لپٹ گیا۔

"کیلا دو

عبدل نے اُس کو دیکھا تو اُس کے چہرے
پر ہنسی دوڑ گئی ـــــــ وہ بولا۔
" اچھا شام کو۔"
بچہ ابھی کچھ بولا بھی نہ تھا۔ کہ ایک کالی عورت
ہاتھ میں چھڑی لیے ہوئے آئی اور اُس بچے کو مارنا شروع
کر دیا۔ بچہ "نہیں اماں، نہیں اماں" کہہ کر چلّانے لگا۔ لیکن
عورت مارتی ہی گئی۔ عبدل سے نہ دیکھا گیا۔ اُس
نے کہا:۔
" اس کو تم اتنا مارتی کیوں ہو؟"
عورت نے چڑ کر کہا:۔
" تم کون ہوتے بولنے والے جی...... چین
سے رہتا ہے اور نہ رہنے دیتا ہے۔"
عبدل نے کہا:۔
" غصہ ہونے کی تو کوئی بات نہیں۔ سنو
بچے تو سبھی بدمعاشی کرتے ہیں........"
عورت نے بات کاٹ کر کہا:۔
"کیا اس کے باپ کا میرے پاس کچھ دھرا
ہے........ کھاتا ہے اور مجھے ستاتا ہے........ کہیں

جاتا بھی نہیں کم بخت ۔ کئی بار نکال دیا ۔ پھر چلا آیا ۔"
عبدل عورت کا منہ دیکھنے لگا ۔ عجیب عجیب خیال اُس کے دماغ میں آئے اور نکل گئے ۔ عورت اپنے گھر کی طرف جانے لگی تو عبدل نے روک کر کہا :۔

" تو تم اس کو نکالنا چاہتی ہو ' کیوں ؟"
عورت نے منہ بنا کر جواب دیا ۔
" نکلتا ہی نہیں بدمعاش ۔ کل بھی بازار میں چھوڑ آئی تھی کہ کہیں چلا جائے ۔ مگر پھر واپس آگیا ۔"
عبدل نے کہا :۔
" تم عجیب قسم کی ماں ہو ؟"
عورت کا منہ اور زیادہ بن گیا ۔ اور وہ ناک بھوں چڑھا کر بولی :۔
" میں اس کی ماں کیوں ہونے لگی ۔"
عبدل اور گھبرایا ۔ بولا :۔
" تم پر یہ اتنا بھاری ہے ۔ تو مجھے دیدو ۔"
عورت نے جلدی سے کہا :۔
" لے جاؤ تو پاپ کٹے ۔ ابھی لے جاؤ ۔ بڑی مہربانی ۔"

عورت کے چہرے پر اطمینان کا رنگ چمکنے لگا۔ عبدل نے بچے کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے عورت سے پوچھا:۔

"آخر اس کے ماں باپ کون ہیں۔ اور تم کو یہ کہاں سے مل گیا ــــــ؟"

عورت نے کہا:۔

"بھائی مفت کا پاپ میرے گلے پڑا۔ باپ کا تو اس کے پتہ ہی نہیں۔ ماں کا نام رجیا تھا اس کا بیاہ میرے پہلے مرد سے ہوا تھا۔لیکن بیاہ کے چار ہی مہینے کے بعد یہ پیدا ہوگیا ــــــ وہ بڑا شریف آدمی تھا۔ اُس نے اس کو نکالا نہیں۔ ایک برس بعد وہ مرگئی۔ تو مجھ سے اُس نے بیاہ کرلیا۔ یہ میرے ساتھ رہنے لگا ــــــ پھر کچھ دنوں کے بعد میرا مرد بھی مرگیا۔ مگر اس کم بخت کو میرے گلے منڈھ گیا۔ اب میں نے دوسرا بیاہ کرلیا ہے۔ میرا یہ مرد اس کو رکھنا نہیں چاہتا۔ اور یہ کہیں جاتا بھی نہیں۔ میں بڑے جنجال میں تھی...... تم نے بڑی مہربانی کی بھائی۔"

عبدل منھ کھولے ہوئے عورت کی بات سنتا رہا ــــ پھر بچے کی پیشانی پر جلدی جلدی کئی بوسے دیئے ــــ اور گودی میں اٹھاکر اپنے چھوٹے سے مکان میں چلا آیا ــــ

(ایک روسی کہانی سے متاثر ہوکر)

روٹی کا ٹکڑا

میسور کی تیسری لڑائی زوروں پر تھی ٹیپو سلطان اس کوشش میں تھے کہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کریں، اور انگریز اس فکر میں تھے کہ ٹیپو سلطان کو شکست دیدیں تاکہ ہندوستان میں چین سے رہ سکیں۔ دونوں کی فوجیں میدان میں پہاڑوں کی طرح جمی ہوئی تھیں۔

سلطان لڑائیوں میں خود معمولی سپاہیوں کی طرح لڑا کرتے تھے۔ ہر سپاہی کی خبر گیری کیا کرتے تھے۔ فوجیوں کے آرام کا خیال اُن کو اپنے آرام سے زیادہ تھا اگر کسی سپاہی کو کوئی تکلیف پہنچتی تھی تو اُن کی روح کانپ جاتی تھی۔ اسی لیے آج سلطان بہت زیادہ پریشان تھے رسد بالکل ختم ہو چکی تھی۔ تمام سپاہیوں میں ایک ایک خشک روٹی تقسیم کی گئی تھی۔ اور یہی ایک خشک روٹی سلطان کے

حصے میں بھی آئی تھی۔ اُنھوں نے رات کو بھی کچھ نہ کھایا تھا
پریشانی میں کب کسی کو کوئی چیز اچھی معلوم ہوتی ہے۔ مگر خبر آچکی
تھی کہ سامان رسد روانہ کیا جا چکا ہے۔ دوسرے دن اس
کے پہنچ جانے کی امید تھی۔

سلطان پریشان حال اپنے خیمے میں بیٹھے ہوئے
تھے۔ اگر کل سامان نہ آیا تو انجام کیا ہوگا؟ ساری فوج کے
فاقے کا خیال آتے ہی وہ کانپ گئے۔ پھر اللہ کی ذات
پر بھروسہ کر کے کھڑے ہو گئے کہ جاکر دیکھیں لوگوں کا کیا حال
ہے۔ کھڑے ہوئے تو دیکھا کہ اُن کے حصے کی روٹی رکھی ہوئی
ہے۔ بھوک معلوم ہو رہی تھی۔ سلطان نے روٹی اٹھالی اور
کھانے لگے۔ لیکن کچھ تو سوکھی روٹی ہونے کی وجہ سے اور
کچھ پریشانی کی وجہ سے روٹی اچھی نہ معلوم ہوئی اور انھوں
نے آدھی روٹی اپنے ملازم کو دے دی آدھی رکھ چھوڑی۔
ملازم صبح ہی کھا چکا تھا، اُس کا پیٹ بھرا ہوا تھا۔ اُس
نے سلطان سے تو روٹی لے لی، لیکن نظر بچا کر پھینک دی۔
سلطان نے دیکھا اور خاموش ہو رہے۔ سوچتے رہے کہ
میں نے غلطی کی جو روٹی اُسے دیدی۔

اسی سوچ میں تھے کہ ایک خستہ حال نوجوان

سلطان کے خیمے کے سامنے سے گزرا اُس نے روٹی اٹھالی اور گرد صاف کرکے کھانے لگا۔ سلطان کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی وہ نوجوان فوجی نہ تھا، نہ تو اُس کے جسم پر فوجیوں جیسا لباس تھا اور نہ وہ اتنا تندرست و توانا تھا۔ سلطان اٹھے اور نوجوان کو پکڑ کر اپنے خیمے میں لے آئے۔ اور پوچھا کہ تم میدانِ جنگ میں کیسے آئے۔ تمھاری یہ حالت کیوں ہے۔ نوجوان نے کہا "میں میدانِ جنگ میں اس لیے آیا ہوں کہ سلطان سے مل سکوں۔ شہر میں تو لوگ، اُن کے پاس پہنچنے نہیں دیتے۔ شاید یہاں ملاقات ہو جائے۔ تم بتا سکتے ہو کہ سلطان ٹیپو کہاں ہے؟"

سلطان نے فرمایا۔ بتاؤ سلطان سے تم کس لیے ملنا چاہتے ہو؟ میں تمھاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟

نوجوان نے دریافت کیا "تم کون ہو؟"

سلطان نے جواب دیا "میں بھی اوروں کی طرح میسور کا ایک سپاہی ہوں۔ ممکن ہے کچھ تمھاری مدد کرسکوں۔"

نوجوان نے کہا "دوست اگر تم میری مدد کرسکتے ہو تو سب سے پہلے مجھ کو کچھ کھلاؤ، پھر سلطان تک پہنچا دو۔"

سلطان نے روٹی کا دوسرا ٹکڑا اپنے لیئے رکھ چھوڑا تھا۔ نوجوان کو دیدیا۔ نوجوان نے کھالیا اور پوچھا کہ اور ہے؟ سلطان نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا "نہیں" نوجوان نے کہا" اب مجھے سلطان کے پاس پہنچادو۔" سلطان نے کہا۔

"تمھیں جو کہنا ہو، مجھ سے کہو میں سلطان سے جاکر کہدوں گا۔ سلطان تو میسور ہی میں ہیں۔ یہاں تو سپاہیوں کے سوا اور کوئی نہیں۔ تم جانتے ہو کہ کوئی سلطان کبھی میدان جنگ میں نہیں آتا۔ سلطان خود محل میں رہتا ہے۔ مرنے کے لیے سپاہیوں کو میدان میں بھیج دیتا ہے۔ اب تم بتاؤ کہ تمھیں سلطان سے کیا کہنا ہے۔ میں اُن سے کہدونگا، میں اُن کا خاص آدمی ہوں۔"

نوجوان نے ایک سرد آہ بھری اور بولا "آہ! یہاں بھی ملاقات نہ ہوئی۔ سلطان ٹیپو کو تو سب لوگ بہادر اور شجاع کہتے ہیں۔ لیکن وہ بھی دوسرے بادشاہوں کی طرح آرام طلب اور عشرت پرست ہے۔ اب معلوم ہوا کہ سب بادشاہ ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ سب کو اپنے عیش و عشرت سے کام ہوتا ہے۔"

سلطان نے دلاسا دیتے ہوئے کہا: "میرے دوست گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم بتاؤ تو تمھیں کیا ضرورت ہے۔ تم ان سے کس لیے ملنا چاہتے ہو؟ میں فوراً تمھارا پیغام اُن کو پہنچا دوں گا۔"

نوجوان نے کہا: "میں کچھ نہیں چاہتا۔ میں میدانِ جنگ میں صرف مرنے کے لیے آیا ہوں اور سلطان سے صرف مرنے کی اجازت لینی تھی۔ اب میرے لیے زندگی سے موت ہی بہتر ہے۔ خیر سلطان اجازت نہ دیں میں موت کے منھ میں آ ہی چکا ہوں۔"

سلطان نے ہمدردی کے ساتھ دریافت کیا۔

"میرے عزیز دوست تم زندگی سے اس قدر کیوں اُکتا گئے ہو؟ آخر تمھارے ساتھ کیا بات ہے۔ تمھاری حالت عجیب سی ہو رہی ہے۔ تم نے وہ سوکھی روٹی شوق سے کھالی جو میرے نوکر نے پھینک دی تھی۔ آخر تمھارا یہ کیا حال ہے؟"

نوجوان نے کہنا شروع کیا: "میرا یہ کوئی نیا حال نہیں ہے۔ یہ چیز تو اب میرے لیے پرانی ہو چکی ہے۔ ایک زمانے سے سڑک پر گرے ہوئے سوکھے ٹکڑے کھا کر زندگی کے دن کاٹ رہا ہوں۔ اب عاجز آ چکا ہوں اس لیے

مرنے آیا ہوں - اب میرے لیئے دنیا میں دل کشی نہیں ہے - بہتر یہی ہے کہ میں مرجاؤں ......"

نوجوان ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگیا، اُس کی آنکھوں میں آنسو ٹپکنے لگے - اور وہ کچھ سوچنے لگا - سلطان پر بھی اس کا بہت زیادہ اثر ہوا - اُن کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے اور وہ کہنے لگے -

"دوست تم خاموش کیوں ہوگئے ؟"

"ہاں" نوجوان نے کہنا شروع کیا "گزشتہ جنگ کا قصہ ہے کہ میں بھی فوج میں ملازم تھا - میرے ہی گاؤں کا ایک اور شخص بھی سلطان کی فوج میں رسالہ دار تھا، میں نے بھی ترقی کی اور رسالہ دار ہوگیا - جب جنگ ختم ہوئی تو میں خوش ہوکر گھر گیا - میری بیوی مجھے اپنی روح سے بھی زیادہ عزیز تھی، خوش ہوکر ملی میں اُس سے مل کر جنگ کی ساری مصیبتوں کو بھول گیا تھا - اور جب پھر واپس آیا تو بالکل تازہ دم تھا -

"دوسرا رسالہ دار بھی وطن گیا - اُس نے میری بیوی کو دیکھا اور اُس کا عاشق زار بن گیا - میرے دوست اُس کی صورت ایسی ہی پیاری تھی - تم بھی اگر دیکھتے تو عاشق ہوجاتے - یہ مردود گیا اور میری بیوی سے بولا کہ سلطان کو کچھ خوب صورت اور عقل مند

عورتوں کی جاسوسی کرنے کے لیے ضرورت ہے۔ میری بیوی نے خوشی سے
اپنی خدمات پیش کیں اور اس کے ساتھ چلی آئی۔ اور پھر گھر واپس نہ گئی۔
پھر نوجوان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے
ضبط کرنا چاہا۔ لیکن ضبط نہ ہو سکا۔ زور سے رونے لگا۔ سلطان نے سمجھا
بجھا کر اُسے خاموش کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کہنے لگا۔
"دو کچھ دن کے بعد میں پھر فرصت لے کر گیا۔ لیکن
اس کا پتہ نہ چلا۔ معلوم ہوا کہ اکرام خاں کے ساتھ گئی ہے۔ اور اکرام خاں
کے غائب ہونے کی خبر میں سن چکا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میری بیوی اس
سے چھین لی گئی۔ یہ غضب ہو گیا۔ میں بالکل بزدل ہو گیا۔ میرے دوست تم
یقین کرو کہ جب میں چھاؤنی میں آتا تھا اور وہ [illegible]
تو میری ہمت چار گنا زیادہ ہو جاتی تھی۔ جب وہ میری کمر سے تلوار باندھ
کر مسکراتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ میری رگ رگ میں شجاعت کی برقی
لہریں دوڑا رہی ہے۔ جب وہ آنکھیں مٹکا کر کہتی تھی خدا تمھیں جلد واپس
لائے تو مجھے یقین ہو جاتا تھا کہ اس کی دعا منظور ہو گئی اور میں اس کو
جلد ہی دیکھوں گا۔ اگر کوئی جنگ بھی سر پر آ گئی تو میں اسے فتح کر لونگا۔
لیکن اب وہ گھر اکیلا تھا۔ میرے دوست میں بالکل بزدل ہو گیا
تم نے گزشتہ کسی جنگ میں اللہ داد خاں رسالدار کی بہادری کے قصے
سنے ہونگے۔ تم یقین کرو وہ بہادر اللہ داد خاں اور بہادر سنجیدہ کے ساتھ

ہی کھو گیا۔ وہ بھی کہیں روپوش ہو گیا۔ تمھارے پاس بزدل اللہ داد بیٹھا بول رہا ہے۔ اللہ داد کا ماتم ہوا تھا یا نہیں؟ —— اتنا کہہ کر پھر وہ رونے لگا۔ آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کی گھنونی اور بے ترتیب داڑھی پر گرنے لگے۔ سلطان کا دل بھی پھٹنے لگا۔ ضبط کرنے کے باوجود رونے لگے اور خوب روئے۔

نوجوان جب خاموش ہوا تو سلطان نے فرمایا"۔ تم یقین کرو میں تمھاری سنجیدہ کو ڈھونڈ کر تمھیں لادونگا"

نوجوان نے بات کاٹ کر کہا" وہ وہ تو ابھی کل ہی ملی تھی۔ مگر میں نے اُس کو پہچانا بھی نہیں۔ اُس کی صورت بھی وہ نہیں رہی۔ اب وہ بالکل مرجھایا ہوا گلاب کا پھول معلوم ہوتی ہے۔ اسی نے مجھ کو پہچانا دیکھتے ہی رونے لگی۔ سارا حال بتایا کہ اکرام دھوکے سے لے گیا۔ پھر زبردستی اپنی بیوی بنا لیا۔ میں نے کہا کہ پھر میرے ساتھ چلو، تو وہ کہنے لگی کہ اب تمھارے ساتھ رہنے کے قابل نہیں ہوں۔ وہ مجھے اب بھی ویسا ہی بہادر سمجھتی ہے۔ کہنے لگی کہ بہادروں کو فریب خوردہ عورت سے دور رہنا چاہیے کیونکہ عورت فریب کھا کر خود بھی فریب کار بن جاتی ہے۔ ہاں وہی بولی تھی کہ اُس نے اکرام خاں کو فریب سے قتل کر دیا تھا۔ اب وہ بھیک مانگ کر زندگی گزارتی ہے......۔

نوجوان پھر رونے لگا اور ہچکیاں بندھ گئیں۔

سلطان نے نہایت مہربانی کے ساتھ کہا "میرے دوست میں تمھیں بہت جلد اُس سے ملا دونگا۔ تم یقین کرو۔ لیکن اُس کو قرار نہ آیا۔

اُسی روز شام کو رسد کا سامان پہنچ گیا۔ سلطان نے اُسے خوب کھلایا نئے کپڑے پہنائے اور کہا اگر خدا نے چاہا تو تمھاری آیندہ زندگی پہلے سے بہت اچھی گزریگی۔ اور اسی طرح کی باتیں کرتے رہے چند دوسرے افسر آئے اور کچھ مشورہ کرکے چلے گئے اللہ داد نے سنا بھی نہیں کہ کیا باتیں ہوئیں۔

رات کو سلطان نے اُسے اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ اُسی وقت ایک سپاہی آکر کہہ گیا کہ پچھلی رات کو جناب کی ڈیوٹی پڑی ہے۔ کھانا کھاکر سلطان سو رہے۔ دن بھر کے تھکے تھے۔ خوب گہری نیند آئی لیکن اللہ داد برابر جاگتا رہا۔ اس کو جاگنے کی عادت ہو چکی تھی پچھلی پہر کو سپاہی سلطان کو بلانے آیا تو اللہ داد نے سلطان کو اٹھانا مناسب نہ سمجھا اور خود سلطان کے کپڑے جو معمولی سپاہیوں جیسے تھے پہن کر سپاہیوں کے ساتھ ہو گیا، سلطان سوئے رہے۔

اللہ داد باہر آیا تو تمام سپاہیوں نے اُس کو باضابطہ سلام کیا۔ وہ بھی فوجی تھا، اُس نے باضابطہ جواب دیا۔ رات کی تاریکی میں اس کو کوئی بھی نہ پہچان سکا۔ اللہ داد نے

سمجھا کہ میرا دوست کوئی بڑا افسر ہے۔

اللہ داد سپاہیوں کے ساتھ پہرہ دیتا رہا۔ اتفاقاً انگریزوں کا ایک گولہ سر پہ آکر گرا اور اللہ داد اپنے ساتھیوں کے ساتھ مارا گیا۔

تمام فوج میں کھل بلی مچ گئی کہ سلطان گشت کو نکلے تھے اور اُن پر گولہ گرا، شہید ہو گئے۔ سلطان کی نیند ٹوٹ گئی دیکھا کہ اُن کا دوست اور ان کی وردی دونوں غائب۔ سمجھ گئے کہ دوست نے میرے لیئے جان دیدی۔ اور سرداروں سے سارا ماجرا بیان کیا۔

صبح ہوئی تو اللہ داد کی لاش فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کی گئی۔ سلطان سر جھکائے واپس آرہے تھے کہ ان کو راہ میں خشک روٹی کا ایک ٹکڑا ملا۔ سلطان نے جھک کر اٹھا لیا۔ صاف کرکے لائے، اُسی ٹکڑے پر اللہ داد کے نام کی فاتحہ پڑھی اور سب کے سامنے روٹی کا ٹکڑا کھا گئے۔ سب کے سب متحیر تھے۔ سلطان نے آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے فرمایا۔

"حیرت کی کوئی بات نہیں۔ خشک اور راستے پر پڑی ہوئی روٹی کا ٹکڑا میرے جاں نثار دوست کی خوراک تھی۔"

سلطان رونے لگے، کوئی نہ سمجھ سکا کہ واقعہ کیا ہے۔

سادھو

گاؤں سے بہت دور ندی کے کنارے چھوٹی سی
ایک کٹیا تھی، جس کے چاروں طرف طرح طرح کے پھولوں کا
ایک چھوٹا سا جنگل تھا۔ سادھو مہاراج ایک زمانے سے وہاں
رہا کرتے تھے۔ میں بچپن میں اکثر وہاں پھول چرانے کے لیے
جایا کرتا تھا۔ اور کبھی پرشاد مانگنے۔ کٹیا کے سامنے مہاراج کے
عقیدت مندوں کا ایک ہجوم رہتا تھا۔ لیکن کوئی بھی اُن کے
صحیح حال کو نہ جانتا تھا۔

اکثر رات کے سناٹے میں، جب گاؤں والے
آرام کی میٹھی نیند میں ہوتے "ہرے رام ہرے رام" کی آواز
سنّاٹے کو چیر کر ساری فضا پر چھا جاتی۔ بچپن میں اکثر اس آواز
کو سُن کر میں ڈر گیا تھا۔ لیکن اب پھر ایک بار سننے کی تمنا ہے
مہاراج راتوں کو سارے گاؤں کا چکر لگایا کرتے تھے۔

میں نے بچپن میں بھی دوسرے سادھوؤں کو دیکھا تھا۔ اور اب بھی گلی کوچوں میں معمولی بھیک منگوں کی طرح بھیک مانگتے ہوئے اکثر سادھو کو دیکھتا ہوں۔ مگر مہاراج کو میں نے تو کیا کسی نے بھی کسی سے کچھ مانگتے نہ دیکھا۔ کسی سے کچھ مانگنا تو ایک طرف کسی کا تحفہ قبول کرتے ہوئے بھی نہ دیکھا۔ البتہ ایک زمیندار نے پانچ بیگھہ زمین کی آمدنی مہاراج کے لیئے الگ کردی۔ اُسی آمدنی سے مہاراج اپنا کام چلاتے تھے۔

مہاراج کے پاس ایک پیارا سا طوطا تھا، جو صبح کے وقت آشنان کرنے والوں کو "ہرے رام ہرے رام" کے دل لبھانے والے بھجن سنا کر اپنی طرف متوجہ کرلیا کرتا تھا۔ مہاراج کو یہ طوطا بہت عزیز تھا۔

مہاراج کے بارے میں اُن کے عقیدت مندوں میں بہت سی باتیں مشہور تھیں۔ کوئی کہتا کہ وہ راتوں کے سناٹے میں پرندوں کی طرح ہوا میں اُڑتے ہیں۔ کوئی کہتا کہ اُن کے بدن کا ہر حصہ جدا ہو کر ایشور بھگتی کرتا ہے۔ کوئی کہتا کہ وہ ساری رات ندی میں کھڑے ہو کر تپسیا کرتے ہیں اور اُن کے چہرے پر ایسا نور برستا ہے جس سے دور تک

اجالا ہو جاتا ہے۔ غرض کہ جتنے منھ اتنی باتیں۔ لیکن مہاراج دراصل کیا تھے کوئی نہ جانتا تھا۔

جب میں بی۔ اے کا امتحان دے کر گھر آیا تو میرے چچا مجھے پکڑ کر مہاراج کے پاس لے گئے۔ اُن کا خیال تھا کہ میرے حال پر مہاراج کی نظر ہو گئی تو میں ضرور پاس کر جاؤں گا۔ مجھے اس پر یقین نہ تھا لیکن میں دوسروں کی طرح کسی کو برا بھلا کہنا بھی پسند نہیں کرتا۔ لوگوں کی ضد سے مجبور ہو کر میں مہاراج کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

پہلے پہل جب میری نظریں مہاراج سے چار ہوئیں تو میرے سارے بدن میں کپکپی سی پیدا ہو گئی۔ اور میں کچھ نہ کہہ سکا۔ اُن کی آنکھیں ایسی لال تھیں جیسے کسی شرابی کی۔ داڑھی مونچھوں اور سر کے بال الجھے اور بکھرے ہوئے تھے کتنا پر جلال چہرہ تھا۔

میرے چچا نے اُن سے کیا کیا کہا میں نہ سن سکا میں اپنے خیالوں میں اتنا غرق تھا کہ دوسری طرف بالکل ہی دھیان نہ دے سکا۔ میں سوچ رہا تھا۔ آخر میں ایک انسان سے مرعوب کیوں ہوا جاتا ہوں، مجھے کبھی اِن سے یا کسی سادھو سے عقیدت مندی نہ رہی۔ پھر ان کی آنکھوں میں

کونسی طاقت ہے جو میری روح پر آہستہ آہستہ قبضہ کرتی جاتی ہے۔ میں پسینہ پسینہ ہوا جارہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مہاراج نے خود ہی مجھے جانے کے لیے کہا۔ اور یہ بھی کہا کہ کبھی کبھی آیا کرو۔

میں ہر روز مہاراج کی خدمت میں حاضر ہونے لگا۔ اب مجھے اُن سے کچھ عقیدت سی ہوگئی تھی۔ دھیرے دھیرے اُن سے باتیں کرنے کی ہمت بھی مجھ میں پیدا ہوگئی اور بہت سے مسئلوں پر اُن سے آزادی سے بات چیت ہونے لگی مجھے اُس وقت بڑی حیرت ہوتی تھی۔ جب مہاراج غیر ملکی تاریخ یا موجودہ دنیا کی مادہ پرستی پر بحث کرتے تھے جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اُن کا مطالعہ بہت زیادہ ہے۔ لیکن ظاہرا صورت میں اُن کا مطالعہ اس قدر وسیع ہونے کی کوئی وجہ نظر نہ آتی تھی۔ میں حیرت سے صرف اُن کا منہ دیکھا کرتا تھا۔

مہاراج سے اس قدر عقیدت مندی نے میرے متعلق لوگوں میں غلط فہمی پیدا کردی۔ ماں سے جاکر کسی نے کہہ دیا کہ منوہر سادھو ہوجائے گا۔ وہ رونے لگیں۔ میں نے اُن کو ہزار سمجھایا لیکن وہ برابر کہتی رہیں کہ مہاراج کے پاس نہ جایا کر۔ اور جب میں نہ مانا تو انھوں نے مہاراج کو ہی کہلوا

کہلا بھیجا کہ اس کو اس ارادے سے باز رکھئے۔ حالانکہ میرے دماغ میں کبھی بھی سادھو ہونے کا خیال پیدا نہ ہوا تھا۔

ایک دن جب میں مہاراج کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ بولے "منوہر! اب تم نہ آیا کرو۔ ہاں یہ کہتے ہوئے مجھے کچھ تکلیف ضرور ہوتی ہے۔ لیکن اب نہ آیا کرو۔"

میں نے حیرت سے اُن کو دیکھا اور دریافت کیا۔

"کیوں مہاراج! کیا مجھ سے کوئی قصور ہوگیا ہے۔ اگر قصور ہوا تو معاف کردیجیے۔ میں آپ کے چرن چھو کر معافی مانگتا ہوں۔"

مہاراج بولے۔

نہیں منوہر! کوئی قصور نہیں ہوا۔ سنو۔ لوگوں کا خیال ہے کہ تم بھی سادھو ہوجاؤ گے۔ اس لیے منع کرتا ہوں۔"

میں نے ادب کے ساتھ عرض کیا۔

"مہاراج! یہ تو ضرور ہے کہ لوگوں کو ایسی غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے۔ سادھو ہونے کا خیال میرے دماغ میں کبھی نہ آیا۔ لیکن اگر یہ خیال ہو بھی تو بُرا کیا ہے؟

مہاراج کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ انھوں نے مجھے غور سے دیکھا اور بولے۔

"منوہر! سادھو ہونے کا خیال اگر برا نہیں تو اچھا بھی نہیں ہے اور تمھارے جیسے ہونہار نوجوان کا سادھو ہونا تو بہت بڑا پاپ ہے۔ میرا تو یہی خیال ہے کہ جوانی میں اگر کوئی سادھو بن جائے تو پاپی ہے اور بڑھاپے میں سادھو ہوجائے تو کوئی کمال نہیں۔ کیونکہ وہ زمانہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ دل خود بخود پناہ ڈھونڈھنے کے لیے یوگ کی طرف بڑھتا ہے۔

غیر ارادی طور پر میں اُن سے سوال کر بیٹھا۔

"تو مہاراج! پھر آپ سادھو کیوں ہو گئے؟"

مہاراج کا دمکتا ہوا چہرہ یک بیک ماند پڑ گیا

جیسے چاند پر کالے بادل آجائیں۔ اُنھوں نے مجھے گہری نظر سے دیکھا، اس وقت اُن کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے مہاراج گلوگیر آواز میں بولے۔

"منوہر! میرے عزیز! تم نے یہ عجیب سوال کر دیا۔ جس کا جواب میں کسی کو دینا نہ چاہتا تھا۔ اور شاید دوسرے کو اس کا جواب نہ دیتا۔ تمھیں بھی اس کا جواب اس لیے دے رہا ہوں کہ تم کسی غلط فہمی میں پڑکر نقصان نہ اٹھاؤ۔ اور پھر سادھو ہونے کا خیال کبھی تمھارے دماغ میں پیدا ہی نہ ہو۔

"منوہر! دنیا ایسی خوب صورت

فریبوں سے بھری ہوئی ہے کہ کوئی شخص آسانی کے ساتھ اپنی نظر اس طرف سے نہیں پھیر سکتا۔ اور اگر کوئی اپنی نظر پھیر کر چلا جانا چاہے تو اس کے خوب صورت فریبوں میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ جہاں تک میرا تجربہ ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ بچانوے فی صدی سادھو تو ایسے ہیں جو صرف کسب معاش کے لیے سادھو بنے ہیں۔ لیکن دنیا والوں نے اُنھیں نفس کشی کی سند مفت میں دیدی۔ یا پھر کسی ایسی وجہ سے، جس کا دفیعہ سوائے اس کے اور کوئی دوسرا نہیں۔

"بہت سے لوگ بیوی، ماں، بھائی بہنوں سے لڑکر غصے میں سادھو ہوگئے۔ سادھو کے روپ میں بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو مشہور چور، بدمعاش اور قاتل ہیں۔ اور اب دنیا والوں کی نظر سے بچنے کے لیے سادھو کی صورت میں چھپے ہوئے ہیں۔ ہاں ایسے لوگ بھی ہیں جو صرف ایشور بھگتی کے لیئے سادھو ہوگئے ہیں۔ لیکن میں اُن کو بھی اہمیت نہیں دیتا ایسے سادھوؤں سے میری نگاہ میں اُس گرہست کی عزت زیادہ ہے جو اپنے بیوی بال بچوں کے ساتھ رہ کر نیک زندگی گزار دیتا ہے۔ گناہوں سے بچنے کے لیے دنیا کو چھوڑ کر بھاگ جانا تو اس کی کمزوری کی انتہائی دلیل ہے۔ غور کرو اصل میں شخص کو

تم زیادہ عزت دوگے جو دریا میں اترے اور تیر کر پار ہو جائے یا اس کو جو ڈوب جانے کے خوف سے دریا سے دور ہی دور بھاگا پھرے۔

خیر اب میری دکھ درد بھری کہانی بھی سنو، جس نے مجھے سادھو بننے پر مجبور کر دیا۔ اور اس کے بعد غور کرو کہ میں نے اس میں کیا کمال کیا۔ میرا کوئی کمال نہیں، بلکہ تم کو میری انتہائی کمزوری صاف معلوم ہو جائے گی۔ اور تم دیکھو گے جہاں ایک طرف گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے خیال سے میں دنیا کو چھوڑ کر سادھو ہو گیا ہوں تو دوسری طرف بال بچوں اور بیوی کو چھوڑ دینے کے گناہ کا مرتکب بھی ہو گیا ہوں۔

مہاراج تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ میں حیرت سے منھ تکتا رہا۔ میری حالت عجیب تھی۔ مہاراج کی گفتگو سن کر دماغ میں بجلی کی لہریں دوڑ رہی تھیں اور سارے جسم سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ مہاراج نے میری طرف عجیب انداز سے دیکھا پھر بولے۔

"سنو! میں ایک دولت مند برہمن خاندان میں پیدا ہوا۔ ماں باپ کا اکلوتا تھا۔ میری ایک پھوپی تھیں وہ بھی شادی کے کچھ دن بعد ہی بیوہ ہو گئیں۔ اور ان کے بھی کوئی اولا

نہ تھی ۔ میں بڑے لاڈ پیار سے پالا گیا ۔ پھوپھی تو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ پیار کرتی تھیں ۔ اگر میری شرارتوں پر کبھی پتاجی ڈانٹ دیا کرتے تھے تو وہ رو رو کر اپنا حال خراب کرتی تھیں اور اسی لئے وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر الہ آباد چلی آئیں ۔ اور میرا نام اسکول میں لکھوا دیا ۔ اُس وقت میری عمر دس سال ہو گی ۔
"میری پھوپی کے پاس ایک کہارن نوکرنی تھی
اس کا نام روہنی تھا ۔ روہنی بیوہ تھی اس کی صرف ایک بیٹی تھی اُس کا نام موہنی تھا ۔ جب میں الہ آباد آیا تھا تو موہنی چار سال کی ہو گی ۔ بچپن میں بڑی بھولی معلوم ہوتی تھی اور میں اُس کو بہت پیار کرتا تھا ۔ لیکن اُس وقت موہنی کی طرح میری نگاہیں بھی معصوم تھیں ۔
سنو، منوہر میں صاف صاف کہہ رہا ہوں ۔ ہاں
تو ہم دونوں اپنی عمر کے منازل طے کرنے لگے ۔ سات سال کی عمر میں رواج کے مطابق موہنی کا بیاہ ہو گیا ۔ لیکن رخصتی باقی رہی ۔ کیونکہ ابھی وہ بہت کم سن تھی ۔ موہنی جیسے جیسے بڑھتی گئی میری نگاہیں اُس پر مجرمانہ پڑنے لگیں ۔ آخر ایک خیال میرے دل میں پیدا ہو گیا اور جم کر رہ گیا ۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس خیال کو میں نے دل سے نکالنے کی کبھی کوشش بھی نہ کی بلکہ

اکثر تنہائی میں موہنی کی خیالی تصویر کے ساتھ کھیلنے میں لطف محسوس کرنے لگا۔

میں بی۔اے پاس کر چکا تھا۔ اور ایم۔ اے میں تعلیم پا رہا تھا۔ اُس وقت میری عمر بائیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ میں غیر معمولی ذہانت کا آدمی تھا۔ اس لیئے تمام لوگ جو مجھے جانتے تھے۔ مجھ سے خوش تھے اور بی۔ اے پاس کرتے ہی بہت سی جگہوں سے میری شادی کی باتیں شروع ہوگئی تھیں مگر پتاجی نے کسی کو جواب نہ دیا تھا۔ میں جوان ہو چکا تھا۔ اور موہنی کے گلستان حسن میں بھی شباب کی بہار کھیل رہی تھی۔ میں موہنی کو اپنا بنا لینے کے لیئے بے قرار تھا۔

"میرے ایک عزیز کی شادی تھی۔ پھوپھی وہاں چلی گئیں اور موہنی بھی۔ میں بھی گیا تھا لیکن کھانا کھانے کے بعد وہاں سے واپس آگیا۔ بارہ بجے ہوں گے۔ پھاٹک پر دربان اونگھ رہا تھا۔ اور زنان خانے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے سمجھا کہ پھوپھی جی آگئی ہوں گی اور جا کر دروازہ کھولنے کو پکارا۔ تین آوازیں دینے پر موہنی نے آکر دروازہ کھولا۔

اُس وقت اُس کی عجیب حالت تھی۔ نیند سے ماتی آنکھیں اُلجھے ہوئے بال اور بے ترتیب کپڑے۔ یہ سب دیکھ کر میرا عجیب

حال ہوگیا ۔ مجھ پر نشہ سا طاری ہوگیا ۔ میں نے دریافت کیا کہ سب واپس آئیں یا نہیں ۔ اُس نے جواب دیا نہیں ۔ یکایک میرے دل نے کروٹ لی اور سارے جذبات بیدار ہوگئے ۔ سیدھا اپنے کمرے میں آیا اور مسہری پر بیٹھ کر سوچنے لگا ۔ محض پھوپھی کے خوف سے میں اُس سے کبھی ہنس کر بات بھی نہ کرتا تھا ۔ لیکن آج راستہ بالکل صاف تھا ۔ حریص تمنائیں دل میں چٹکیاں لینے لگیں ۔ ذلیل جذبات مچلنے لگے ۔ اور میں نے اُس کو پکار کر کہا ۔ ایک گلاس پانی دے جا ۔ وہ پانی لے کر آئی میں اس کو اس طرح گھبرا کر دیکھنے لگا جیسے چور عین وقت پر گرفتار ہوکر گھبرا جاتا ہے ۔ میں اُس کو دیکھتا ہی رہا ۔ تو وہ گلاس میز پر رکھ کر چلنے لگی ۔ میں نے اُٹھ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا ۔ وہ جھجک کر علیحدہ ہونا چاہتی تھی ۔ مگر اس کا ہاتھ میری مضبوط گرفت میں تھا ۔ وہ بولی "ہیں ہیں ۔ آپ کیا کرتے ہیں ۔ میں بی بی جی سے کہہ دوں گی " یہ جملہ سن کر میرا سارا نشہ ہرن ہوگیا ذلت و رسوائی کے خوف سے میں کانپ اٹھا ۔ میں نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا ۔ اور اوپر رکھی ہوئی چھری اٹھا کر بولا ۔ موہنی دیکھ میں تیرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ۔ ایک مدت سے دل ہی دل میں تیری پوجا کر رہا ہوں ۔ اب تو نے ٹھکرا دیا تو زندگی

کس کام کی زندگی۔" میں چاہتا تھا کہ چھری اپنے سینے میں پیوست کردوں کہ اُس نے پھرتی کے ساتھ میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔ "آپ یہ کیا کرتے ہیں۔" سرکش جذبات کو پھر تقویت مل گئی اور اُس کو مخاطب کرکے میں نے کہا "تیرے بغیر زندگی بالکل فضول ہے۔ تو اس وقت مجھے روک سکتی ہے مگر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔" اُف عورت کا دل کتنا کمزور ہوتا ہے ذرا سی محبت جتاکر اُس پر فتح حاصل کی جاسکتی ہے۔ موہنی نے خود کو میری آغوش میں ڈال دیا۔

مہاراج اتنا کہہ کر کانپنے لگے جیسے عدالت میں بے گناہ جس پر سنگین جرم کا الزام ہو دیر تک روتے رہے آنکھیں صاف کرکے بولے۔

دو تین مہینے تک انجام سے بالکل غافل ہو کر اُس کے گلشنِ حسن کی گل چینی کرتا رہا۔ اسی زمانے میرے بیاہ کی بات پکی ہوگئی۔ اور میں اپنے گھر دیہات چلا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اس قبول صورت لڑکی پر میری نگاہیں حریصانہ پڑتی تھیں۔ اور میں ہمیشہ گناہ کرنے کو تیار رہتا تھا۔

"کچھ دن بعد موہنی بھی پھوپھی کے ساتھ میرے یہاں آئی۔ ایک دن موقع نکال کر تنہائی میں مجھ سے

بولی کہ حمل کے آثار پیدا ہیں۔کسی بہانے سے مجھے الہ آباد لے چلو
اور حمل ضائع کرادو۔ ورنہ میں کہیں کی نہ رہوں گی ۔ مجھے اُس
کی اس جرائت پر بڑا غصہ آیا۔کیونکہ اب اُس میں میرے لیئے
کوئی خاص دل کشی بھی نہ باقی رہی تھی۔میں نے اُسس کو
سخت ڈانٹ بتائی ۔ اور آئندہ کے متعلق سوچنے لگا۔اُف
گناہ کرنے کے بعد سکون دل سے کس طرح غائب ہوجاتا ہے
مجھے ہر طرح اپنی بدنامی نظر آئی۔لیکن خاموش ہی رہا۔

"دوسرے روز جب لوگ اُٹھے تو موہنی کا
پتہ نہ تھا۔ ہزار ڈھونڈا گیا لیکن پتہ نہ چلا۔ اس حادثے سے
کل لوگوں کو سخت پریشانی تھی، اُس کی ماں روہنی روتے
روتے دیوانی ہورہی تھی، میرے گھر کے کل لوگوں پر بدحواسی
چھائی تھی۔لیکن مجھ پر کچھ اثر نہ تھا۔لوگوں میں طرح طرح کی
افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔لیکن میں سب کچھ جانتا تھا۔ اور
اُس کے لاپتہ ہونے پر اطمینان کا سانس لیتا تھا۔کیونکہ میرا راستہ
بالکل صاف ہوگیا تھا۔ بدنامی کا خوف میرے دل سے نکل
چکا تھا۔اُف گناہ کرنے کے بعد انسان کتنا سخت دل ہوجاتا
ہے۔

ہفتوں، مہینوں، اور سال ہا سال گزر گئے۔

موہنی کا کوئی پتہ نہ چلا۔میرا بیاہ بھی ہوا اور دو بچے بھی ۔ روہنی بیٹی کے غم میں روتے روتے مرگئی ۔مگر مجھے کوئی افسوس نہ ہوا میرے ضمیر نے کبھی ملامت نہ کی ۔اور میری حالت یہ تھی کہ ہر روز ایک پھول کو مسل کر رکھ دینا چاہتا تھا۔کبھی کوئی اچھا خیال میرے دماغ میں پیدا ہی نہ ہوا، نہ معلوم کتنی بدقسمت عورتیں میری جان کو رو رہی ہوں گی ۔

سولہ سترہ سال کا واقعہ ہے کہ میں سیر وسیاحت کی غرض سے بنارس گیا ۔ایک دن صبح کے وقت گائے گھاٹ پر اشنان کرکے گنگا سے نکلا ہی تھا کہ ایک عورت میرے پاس سے گزری، اس نے مجھے غور سے دیکھا اور چلی گئی ۔عورت ادھیڑ عمر کی تھی اور قیمتی لباس پہنے تھی ۔جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دولت مند عورت ہے ۔اب بھی اُس کے چہرے پر حُسن کا پرتو باقی تھا ۔

"دوسرے دن ایک آدمی نے مجھے ایک خط لاکر دیا۔اور بولا کہ شام کو بائی بھی آپ کا انتظار کریں گی ۔یا میں خود آکر آپ کو لے جاؤں؟ میں نے کہہ دیا کہ شام کو آجانا ۔خط میں نام وغیرہ کچھ نہ تھا ۔لیکن یہ معلوم ہوچکا تھا کہ خط کسی طوائف کا ہے ۔اس سے مجھے حیرت نہ تھی ۔کیونکہ میرے لیئے یہ کوئی

نئی بات نہ تھی۔ سینکڑوں طوائفوں سے میری ملاقات تھی۔

"شام کے وقت وہی شخص آیا اور مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ اُسی عورت نے میرا استقبال کیا۔ جس کو گھاٹ پر دیکھا تھا۔ لیکن سخت کوشش پر بھی اُس کو پہچان نہ سکا کہ یہ کون ہے اُس عورت نے مجھ سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "رمیش بابو آپ نے پہچانا"۔ میں نے جھینپ کر کہا۔ "نہیں معاف کیجئے گا"۔ وہ بولی۔ "ہاں اب آپ کیوں پہچاننے لگے۔ سنئے میں ہوں آپ کی برباد کی ہوئی موہنی"۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ خود بخود میری گردن شرم سے جھک گئی۔ میں بالکل خاموش تھا کہ اتنے میں ایک جوان اور خوب صورت لڑکی آئی۔ موہنی نے اُس سے کہا۔ "بیٹی مونا! ان کے چرن لو یہ تمھارے پتا جی ہیں"۔ لڑکی نے میرے پاؤں چھو کر سلام کیا۔ اور ایک طرف بیٹھ کر مجھے ادب اور محبت کی نظروں سے دیکھنے لگی۔ میری حالت ایسی تھی جیسے مجھ پر بجلی گری ہو۔

"میں اُس وقت کی اپنی حالت کیا بتلاؤں، زمین و آسمان مجھے گھومتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کوئی رو رو کر دل کے اندر گھونسے مار رہا ہے۔ موہنی خود ہی بولی "رمیش بابو چپ کیوں ہیں کچھ بولئے تو"۔ مگر میری گردن ایک گنہ گار کی طرح جھکی کی جھکی رہی۔ پھر وہ خود ہی بولی۔

"انسان کو گناہ کی سزا ضرور بھگتنی پڑتی ہے۔ خواہ کسی طرح ہو۔ میں نے اپنے فرض کو بھلا کر اپنی محبت جو کسی دوسرے کی چیز تھی، آپ کے حوالے کر دی۔ اس کی سزا یہ بھگت رہی ہوں آج بیسوا کی ذلیل زندگی گزار رہی ہوں۔ اور گرہست گھر میں پیدا ہونے کے بعد بیسواؤں کی موت مروں گی۔ اور آپ نے مجھے برباد کر کے ٹھکرا دیا اس کی سزا آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے۔ آج میرے ساتھ آپ کی بیٹی بھی بیسواؤں کی زندگی گزار رہی ہے۔"

"موہنی جوش میں نہ جانے کیا کیا کہہ گئی۔ میں خاموشی کے ساتھ اٹھا اور چلا آیا۔ منوہر! اس کے بعد میرے لیئے سوائے سادھو ہو جانے کے اور دوسری کونسی صورت تھی، جس سے نجات کی امید رکھتا۔

اب وہ کٹیا ویران ہے۔ لیکن بشن پور کے مہاراج کا نام اب تک لوگوں کی زبان پر ہے۔

سرلا کا بیاہ
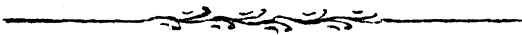
دولت سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے۔ اور ایسا
کیوں نہ ہو جب دولت مندوں کے بنائے ہوئے سماج کے مندر
کی دیوی دولت ہے۔ اُسی کی پوجا ہوتی ہے اس کے سامنے
نہ تو آدمی کوئی چیز ہے، اور نہ خدا۔

مراری بابو کی عمر اسّی برس سے زیادہ تھی، کم
کسی طرح نہ تھی۔ اُن کے پوتے جوان اور بال بچوں والے تھے
انھوں نے اس بڑھاپے میں بیاہ کرنا چاہا۔ کسی نے کہا "کون
ابھاگا ہوگا جو اس عمر میں آپ کو بیٹی دیگا"۔ کسی نے اُن کو
سمجھایا، کسی نے ہنسی اڑائی۔ مگر وہ اپنے خیال پر قائم رہے
قسمت سے ایک مہربان بھی مل گئے۔ لوگوں کی مخالفت کے
باوجود پنڈت بشن دیو نرائن نے بیاہ کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ دو چار
دنوں کی دوڑ دھوپ کے بعد ایک جگہ بات پکی کرادی۔ لڑکی

کی قسمت پھوٹی ۔ اور پنڈت جی کی مٹھی گرم ہوئی ۔ کچھ دنوں تک ہر طرف یہ کہانی سُنی گئی ۔ کسی نے مراری بابو کو بُرا بھلا کہا کسی نے پنڈت جی کو ۔ اور کوئی لڑکی کی قسمت کا رونا رو کر چپ ہوگیا ۔ پھر لوگ جلد ہی بھول گئے ۔ جیسے کوئی بات ہوئی ہی نہیں ۔

لڑکی کا نام سرلا تھا ۔ اُس کا باپ ایک آفس میں معمولی کلرک تھا ۔ ایک بھائی تھا ہریش، وہ لڑکوں کو پڑھا کر خود پڑھتا تھا ۔ اور سرلا کو بھی پڑھا رہا تھا ۔ سرلا انٹرنس پاس کر کے کالج میں داخل ہوئی تھی ۔ مگر گھر کی آمدنی ایسی نہ تھی کہ پڑھائی کو جاری رکھ سکتی ۔ اس لیئے بہت زیادہ شوق ہونے پر بھی اُس کو کالج چھوڑنا اور گھر کا کام سنبھالنا پڑا ۔

سرلا غریب گھر میں پیدا ہوئی تھی ۔ مگر حُسن اور اخلاق کی دولت سے مالا مال تھی ۔ وہ ہر طرح اس قابل تھی کہ کسی راجہ کے محل کی رونق اور پہلو کی زینت بنے ۔ اور اُس کے دل کی رانی بن کر راج کرے ۔ مگر اُس کا باپ غریب آدمی تھا ۔ اور غریب کی بیٹی کا مول ہی کیا ؟

اُس نے جب اپنی قسمت کا فیصلہ سُنا، تو دنیا اُس کی آنکھوں میں اندھیری ہوگئی ۔ دل کی کھلی ہوئی

کلی مرجھا گئی۔ اُف! اس کی جوانی کے گرم اور تند جذبات کا کتنے سرد طور پر استقبال کیا گیا تھا۔ دل کی جلتی ہوئی بھٹی سے خون بھاپ بن کر اڑتا، اور آنکھوں کی راہ سے پانی بن کر نکل جاتا۔

وہ کمرے میں بیٹھی اپنی آنے والی زندگی پر سوچ رہی تھی کہ اس آنے والی زندگی میں کہیں بھی امید کی روشنی نظر آجائے۔ مگر ہر طرف اندھیرا ہی نظر آتا تھا۔ اس کو معلوم ہوا کہ موت کا سرد ہاتھ آہستہ آہستہ بڑھتا آرہا ہے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک بھیانک تصویر بھوت کی طرح ناچنے لگی ——

اسی برس کا بوڑھا مرد، ہڈی اور چمڑے کا ڈھانچہ، پچکے ہوئے گال، جھکی ہوئی کمر، بدن میں تھرتھری، ڈنڈے کے سہارے اُس کی طرف آرہا ہے۔ بوڑھے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ مگر مرجھائی ہوئی۔ آنکھوں میں خوشی کی روشنی بھی ہے۔ مگر بہت ہی دھندلی اور جھلملاتی ہوئی، جیسے بجھتے ہوئے چراغ کی ——

وہ سوچنے لگی آخر اس زندگی کا انجام کیا ہوگا۔ اُس کو اپنی سانس بھاری معلوم ہونے لگی۔ دل بیٹھا ہوا محسوس ہوا۔

وہ انھیں خیالوں میں الجھی ہوئی تھی کہ اس کی سہیلی جمنا آئی اور آتے ہی بولی۔

"کیا سوچ رہی ہو سرلا ..... ؟"

سرلا نے غمگین آواز میں جواب دیا۔

"سوچ رہی ہوں جمنا! کہ اس پاپی زندگی کو کس طرح ختم کروں۔ زہر کھا کر یا گنگا جی میں کود کر۔ اب تو......"

جمنا بولی۔

"پاگل ہوئی ہو سرلا؟ بیاہ کس کا نہیں ہوتا۔ کیا ساری زندگی کنواری بیٹھی رہتیں۔ اٹھو چلو کیرم بورڈ کھیلیں۔"

سرلا کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

بیاہ۔ بیاہ۔ تم سے کس نے کہہ دیا کہ بیاہ ہو رہا ہے۔ بیاہ اسی کو کہتے ہیں........"

اس سے زیادہ وہ کچھ نہ بول سکی۔ اُس کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔ جمنا حیرت سے بولی

"تمھارا کیا مطلب ہے؟"

سرلا نے اُسی طرح بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"جمنا! شاید تم کو معلوم نہیں کہ وہ......"

سرلا کچھ بول نہ سکی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہ کر کنول جیسے گالوں پر ڈھلک پڑے۔ اُس کا سر اور بھی جھک گیا۔ نگاہیں زمین پر جم گئیں۔ جمنا گھبرا گئی۔ اور سرلا کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

"ارے وہ کیا ؟"

سرلا سسکیوں اور ہچکیوں کو مشکل سے روک کر بولی -

"اسّی برس کے بوڑھے ہیں"

معلوم ہوا جیسے جمنا کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی - وہ گھبرا کر بولی -

"تم سچ کہہ رہی ہو سرلا ؟ یہ تو بڑا ظلم ہے"

یہ کہکر جمنا چپ ہو گئی - سرلا کی آنکھوں نے آنسوؤں کی جھڑی باندھ دی - جمنا کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہے - سرلا کو کس طرح سمجھائے اُس کی کس طرح مدد کرے - دونوں چپ بیٹھی نہ جانے کیا کیا سوچتی رہیں - یکایک کمرے سے باہر سائبان میں آواز سنائی دی -

"یہ تو بڑا ظلم ہے پتا جی - سرلا کا بیاہ اس بوڑھے کھوسٹ سے ہو - یہ بڑا ظلم ہے - آپ اُس کو صاف صاف جواب دیدیجیے"

"اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے ہریش - میں چاہتا تھا کہ سرلا کو اچھی حالت میں دیکھوں - اور اسی لیے میں نے بات پکی کر لی - مگر اس کے پرانے جنم کے پاپوں کو کس طرح

دھو دیتا۔ اب معلوم ہوا کہ وہ چالیس برس کے نہیں، اسی برس کے بوڑھے ہیں۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے؟"

"باپ واپ کچھ نہیں ہے۔ یہ سب فضول باتیں ہیں۔ یہ بڑا ظلم ہے۔ آپ کو سوچنا چاہیئے کہ سرلا کی زندگی برباد نہ ہو۔"

"میں کیا کروں ہریش۔ تم جانتے ہو کہ میں نے ہر طرح کوشش کی کہ کوئی اچھا لڑکا مل جائے مگر جو ملا پانچ ہزار سے کم تلک پر راضی نہ ہوا۔ اور جو تلک کم مانگتا وہ جاہل گنوار اور نکھٹو۔ میں سرلا کا باپ ہوں۔ یہ بھی نہیں دیکھ سکتا کہ اُس کی زندگی مصیبت میں کٹے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں پتا جی۔ بہتر ہے کہ کسی بھکاری سے اُس کا بیاہ کر دیجیئے۔ وہ بھیک مانگ کر پیٹ بھر لیگی۔ مگر اُس بوڑھے کھوسٹ سے اُس کا بیاہ نہ کیجیئے کہ اُس کی زندگی آنسوؤں کی ندی میں ڈوب جائے۔"

"اب بات ختم ہو چکی ہریش۔ میں زبان دے چکا ہوں۔ بدل نہیں سکتا۔ اگر سرلا روئیگی تو اُس کے ساتھ میں بھی ساری زندگی روتا رہوں گا۔ مگر زبان نہیں بدل سکتا۔"

ہریش شیر کی طرح گرج کر بولا۔

"آپ زبان نہیں بدل سکتے۔ مگر اس کی زندگی
خراب کر سکتے ہیں۔ آپ کو زبان بدلنی پڑے گی پتا جی۔"
"نہیں ہرگز نہیں وہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"
"اچھا تو یہ آپ کا فیصلہ ہے۔ اب میرا بھی فیصلہ سن لیجئے۔ سرلا کا بیاہ مراری لال
سے نہیں ہو سکتا۔ میں آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے ہاتھ سے اس کے
گلے پر چھری پھیر دوں گا لیکن اس کو کڑھ کڑھ کر مرتے نہیں
دیکھ سکتا۔

"کیا بک رہا ہے۔ پاگل تو نہیں ہو گیا ہے؟
—— دور ہو سامنے سے۔"

"ٹھیک ہے پتا جی! میں پاگل ہو گیا ہوں جس
دن سنا ہے، اسی دن سے۔ میں کہہ دیتا ہوں پتا جی اگر وہ بڈھا
کھوسٹ برات لے کر آیا۔ اور میں کچھ نہ کر سکا تو آپ کے گھر سے
دو لاشیں نکلیں گی۔ ایک مراری لال کی دوسری میری۔ جب
میں اس دنیا میں نہ رہوں گا۔ تب جو جی میں آئے کر لیجئے گا۔ مگر
میری زندگی میں آپ ایسا نہیں کر سکتے۔"
زور سے طمانچہ مارنے کی آواز کے ساتھ پھر
آواز آئی۔
"میں کہتا ہوں کہ تو میرے سامنے سے چلا جا۔

نہیں تو میں تجھے مار ڈالوں گا......"

سرلا اب تک باپ اور بھائی کی باتیں سن کر دل ہی دل میں رو رہی تھی۔ مگر باپ کے آخری لفظوں کو سنتے ہی دوڑی اور اور بھائی سے لپٹ کر بولی۔

"بھیا چلے جاؤ۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں جس حال میں بھی رہوں۔ کبھی اُف نہ کروں گی۔"

مگر ہریش نے بات کاٹ کر کہا۔

"پاگل تو نہیں ہو گئی ہے۔ جا کمرے میں۔"

جمنا نے سمجھا بجھا کر سرلا کے باپ کو باہر بھیج دیا۔ لیکن ہریش غصّے کی حالت میں بولتا رہا۔

"یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں ایسے سماج کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ جس میں معصوم روحوں پر ایسا ظلم ہوتا ہے۔ اس ظلم کے خلاف پوری طاقت کے ساتھ بغاوت کرنے کی ضرورت ہے۔ اور ہو گی۔"

ہریش چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا پھرتا تھا۔ آخر اُس نے سارا حال اپنے کالج کے ساتھیوں اور دوستوں سے کہا۔ نوجوانوں کا دل اس ہونے والے ظلم کی کہانی سن کر جوش میں آگیا۔ سب مل کر بیٹھے۔ اور فیصلہ ہوا کہ ایسا کبھی نہیں ہونے

دیا جائیگا۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے لیکن سرلا کا بیاہ مراری لال سے نہیں ہو سکتا
فیصلے کے مطابق ایک لڑکا مراری لال بابو کے
یہاں بھیجا گیا۔ اُن کو سمجھایا گیا کہ وہ اس خیال سے باز آئیں۔ مگر بڑھاپے
میں بیاہ کا بھوت اُن کے سر پر کچھ اس طرح سوار تھا کہ کسی طرح نہ اُترا
لڑکا اُن کے گھر سے بے عزتی کے ساتھ نکالا گیا۔ اور جس نے بھی
سمجھانے کی کوشش کی وہ دھتکار سن کر واپس آیا۔
آخر برات کا دن آگیا۔ سرلا کے باپ نے دو دن پہلے
مکان شہر سے دیہات میں بدل دیا کہ ہریش کو معلوم نہ ہو۔ مگر اُس
کو ایک ایک منٹ کی حالت معلوم ہوتی رہتی تھی۔ وہ صرف موقع
کے انتظار میں تھا۔

برات آئی اور بڑی شان کے ساتھ آئی۔ آدمی تو کم
مگر شان زیادہ تھی۔ برات کی ہر بات سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑے آدمی کی
برات ہے ـــــ سرلا کے باپ کو معلوم ہو گیا کہ ہریش کو اس مکان کا پتہ چل گیا ہے
اُس نے سوچا کہ بیاہ جلد ہی ہو جائے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی رکاوٹ پیدا ہو۔
مراری بابو بلائے گئے۔ وہ آئے اور مور پہن کر منڈپ میں بیٹھے
معلوم ہوتا تھا کہ مداری کا بندر بیاہ کرنے بیٹھا ہے۔ پنڈت جی بھی آگئے لیکن
ابھی بیاہ کی رسم شروع ہونے والی ہی تھی کہ باہر شور سنائی دیا! ور ایک منٹ میں

پچیس تیس نوجوان، ہرش کے ساتھ گھس آئے۔ سب لوگ یہ دیکھکر دنگ رہ گئے
ہرش نے مراری بابو کے سر سے موڑ چھین لیا۔ دوسرے نے کہا کہ گھر واپس
جائیے۔ مگر وہ مرتے ہوئے سانپ کی طرح اینٹھنے لگے۔ آخر چند لڑکوں نے
اُن کو گود میں اٹھایا، اور مکان سے باہر لے آئے۔ پھر سمجھایا کہ واپس چلے جائیے
مگر وہ نہ مانے تو اُن کو زبردستی موٹر میں بٹھا کر گاؤں سے سات کوس دور
اسٹیشن پر چھوڑ آئے۔

سرلا کے باپ نے شور مچایا۔ مگر اُن کی بھی کچھ نہ چلی! ایک
لڑکے نے انھیں ایک کمرے میں بند کر دیا۔ جہاں وہ چیختے چلاتے رہے۔
پنڈت جی حیرت سے منھ کھولے بیٹھے ہی تھے۔ ہرش نے اپنے ایک ساتھی کا
ہاتھ پکڑ کر منڈپ میں بٹھا دیا۔ اور موڑ اُس کے سر پر رکھ کر بولا۔

"مہاراج اپنا کام ختم کیجئے"۔

پنڈت جی کو اب ہوش آیا۔ وہ رام رام کہتے اٹھے ست جگ
کی میٹھی یاد کے ساتھ کلجگ کی برائی کرتے ہوئے بیاہ کی رسم ادا کرنے سے
انکار کر دیا۔ ہرش غصّے میں بولا۔

"پاگل کہیں کے سمجھتے ہو کہ تمھارے بغیر بیاہ ہو ہی نہیں سکتا
صرف تم ہی برہمن ہو؟ تم نے اپنا ہی گھاٹا کیا"۔ ایک دوسرا لڑکا آیا۔ اُس نے
کچھ منتر پڑھے۔ سرلا کی مانگ میں سیندور پڑا۔ اور بیاہ ہو گیا۔

دوسرے دن ہر آدمی کی زبان پر سرلا کے بیاہ کی کہانی تھی۔

اپنا پرایا

یہ کہانی بڑی پُرانی ہے۔ اُس وقت ملک میں نہ ریل گاڑی تھی اور نہ اس قسم کی دوسری سواری۔ سب سے تیز سواری گھوڑے کی تھی۔

ایک مسافر، گھوڑے پر سوار، سرائے کے دروازے پر آیا۔ گھوڑے کو پیار سے تھپتھپایا اور اتر پڑا۔ دونوں پسینے میں تر تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ مسافر بہت دور سے آرہا ہے، بہت تھکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ مسافر کے لباس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی فوجی سپاہی ہے۔ اس کے اترتے ہی بھٹیارا سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ مسافر نے گھوڑے کی لگام اس کے ہاتھ میں دیدی۔ بھٹیارا گھوڑے کو اِدھر اُدھر ٹہلانے لگا ـــــ مسافر کھڑا کھڑا دیر تک رومال سے پنکھے کی طرح جھلتا رہا۔

شام ہو رہی تھی۔ اور آہستہ آہستہ ہر طرف تاریکی

پھیلتی جا رہی تھی۔ بھٹیارے نے آکر دریافت کیا۔

"حضور۔ آپ کے لیے کیا کیا تیار کیا جائے؟"

"جو جلدی سے ہو جائے۔ سنو میں بہت ہی بھوکا

دیر نہ کرنا۔ لو یہ روپیہ پہلے گھوڑے کو دانہ دے دو" بھٹیارے

نے گھوڑے کو درخت سے باندھ دیا، اور خود مسافر کو لے کر سرائے کے

اندر داخل ہوا، اور بولا۔

"حضور" دیکھئے ادھر کنارے کی طرف ایک کمرہ

خالی ہے۔ سب سے اچھا کمرہ ہے بہت ہوادار ہے۔ یہ کمرہ

صرف بابو لوگ کے لیے ہے۔ ہر دم بند رہتا ہے۔ جب کوئی بڑا

آدمی آتا ہے تو ہم یہ کمرہ کھولتے ہیں۔ آپ کو بھی پسند ہو گا۔"

"ٹھیک ہے۔ تم بڑے عقل مند آدمی معلوم

ہوتے ہو" بھٹیارا مسکراتا ہوا چلا آیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ ایک

بڑے آدمی نے اُس کو عقل مند کہہ دیا تھا۔ غریب آدمی بڑے

آدمیوں کے ہنس کر بولنے سے بھی خوش ہو جاتا ہے۔

بھٹیارے نے اُس کی مرضی کے مطابق سارا

سامان درست کر دیا۔ مسافر کھا پی کر سو رہا۔ تھکا ہوا تھا فوراً ہی

نیند آ گئی۔ نیند کے آغوش میں پڑا پڑا نہایت ہی دل خوش کن

خواب دیکھنے لگا۔ ساری وہی چیزیں اُسے نظر آنے لگیں جس کے

لیے روح بے چین تھی۔ بیوی کا چہرہ دیکھتے ہی اس کا دل باغ باغ ہوگیا۔ غریب عورت پانچ سال سے بیوہ کی سی اُداس زندگی گذار رہی تھی۔ سرخ و سفید چہرہ پیلا پڑگیا تھا۔ ہونٹ نیلے ہوگئے تھے۔ آنکھوں میں سیاہ حلقے پڑگئے تھے، مگر شوہر کو دیکھ کر بشاش ہوگئی۔ مغموم چہرے پر ہنسی کھیلنے لگی۔ جیسے سوکھے ہوے پودے میں پانی پڑ جائے تو وہ سبز ہونے لگتا ہے جیسے گھنا گھور بادل میں کبھی کبھی بجلی چمک جایا کرتی ہے۔

سپاہی کا دل بے چین تھا۔ اپنی بیوی سے نہ ختم ہونے والی محبت کی باتیں کرنے کے لیے۔ وہ چاہتا تھا کہ پانچ سال کی داستانِ فراق چند لمحوں میں ختم کرڈالے۔ مگر بیوی چاہتی تھی کہ پہلے تھکے ہوئے شوہر کے آرام کا سامان کردے۔ پھر اطمینان سے باتیں کرے —— وہ سوچنے لگا کہ آج میری کمر میں دو ہزار روپے بندھے ہیں لیکن پانچ سال سے اس نیک بخت کو ایک کوڑی بھی نہیں بھیجی۔ اس نے کس مصیبت سے گزارہ کیا ہوگا۔

سپاہی نے دیکھا کہ اس کا بچہ، جس گود ہی میں چھوڑ کر گیا تھا، اب ذی ہوش ہوگیا ہے۔ سپاہی نے بچے کو دیکھ کر اپنی آغوشِ محبت پھیلادی لیکن بچہ ڈر کر بھاگ گیا اور

چلاکر رونے لگا۔ سپاہی کے دل پر جیسے کسی نے ایک گھونسہ مار دیا ـــــ اُس کے دل کی عجیب کیفیت ہوگئی ـــــ نیند ٹوٹ گئی ـــــ نیند سے بیدار ہونے کے بعد سپاہی کے دل پر کافی اثر تھا ـــ اُس نے خواب کی باتوں کو بھلاکر پھر سو جانے کی کوشش کی۔ لیکن نیند نہ آئی اور بے چینی بڑھتی گئی ـــ سپاہی اپنے بستر سے اُٹھا ـــ اور بھٹیارے کو آواز دی۔ بھٹیارا آنکھیں ملتا ہوا آیا اور ڈر کر بولا۔

"کیا ہے ہجور!"

"کچھ نہیں۔ نیند نہیں آتی ہے، بیٹھو تم سے باتیں کریں۔"

بھٹیارا پلنگ کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ سپاہی پھر پلنگ پر دراز ہوگیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ لیکن اس کی بے چینی کم نہ ہوئی۔ تو سپاہی نے میدانِ جنگ کے قصے دُہرانا شروع کیے۔ بھٹیارے کو نیند آرہی تھی۔ مگر غریب برابر سنتا رہا۔ ساتھ ہی "ہاں سرکار، ہاں ہجور" کہتا رہا۔ گھنٹوں گزر گئے۔ لیکن سپاہی کا قصہ ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ بھٹیارے کی آنکھیں نیند سے جلنے لگیں۔ مگر غریب جاگتا رہا۔ اور سپاہی کی نہ ختم ہونے والی داستان بادلِ ناخواستہ

سنتا رہا۔ آخر سپاہی کو خود ہی نیند آنے لگی تو، اس نے بھٹیارے کو چار آنے پیسے دیئے اور رخصت کر دیا۔

سپاہی سو گیا۔ تھکا ہوا تھا خوب نیند آئی۔ کچھ دیر کے بعد پاس ہی کے ایک کمرے سے ایک بچے کے رونے کی آواز آنے لگی۔ بچے کی ماں اُسے چپ کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ چپ نہ ہوتا تھا۔ برابر روتا جاتا تھا۔ سپاہی کی نیند بچے کے چیخنے کی وجہ سے پھر اُچٹ گئی۔۔۔ اور وہ بے چینی کے ساتھ بستر پر کروٹ بدلنے لگا۔ دیر تک یہی حالت رہی۔ بچہ برابر روتا جاتا تھا اور اس کی ماں چپ کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر بچہ چپ نہ ہوتا تھا۔

آخر سپاہی کو غصہ آیا۔ اُس نے پھر بھٹیارے کو پکارا۔ بھٹیارا حاضر ہوا۔ سپاہی نے کڑک کر پوچھا، "یہ کون بچہ رو رہا ہے؟"

"ایک غریب عورت کا بچہ ہے۔ بہت بیمار معلوم ہوتا ہے۔"

سپاہی نے کڑک کر کہا۔

"بیمار ہے تو کم بخت دوسروں کی نیند کیوں خراب کرتا ہے۔ اُس سے کہو کہ بچے کو چپ کرے۔"

"حجور۔ وہ بڑی دیر سے چپ کرنے کی کوشش
کررہی ہے مگر بچہ مانتا ہی نہیں ہے۔"
"تو اُس سے کہو کہ کہیں اور جائے' یہ اسپتال
نہیں ہے۔"
"حجور۔ اب تو صبح ہونے والی ہے۔ خود ہی
چلی جائے گی۔"
"نہیں اُس سے جا کر کہو کہ ابھی چلی جائے
—" سپاہی نے ذرا غصّے سے کہا۔
"حجور وہ بڑی مصیبت کی ماری معلوم ہوتی
ہے۔ اُس پر مہربانی کیجئے—" بھٹیارے نے ڈرتے ہوے کہا۔
"جا کر نکالو اُسے—" سپاہی نے گرج کر کہا۔
بھٹیارا خوف سے کانپتا ہوا گیا۔ اُس کا دل نہ
چاہتا تھا کہ تاریک رات میں ایک عورت کو سرائے سے
نکل جانے کو کہے۔ اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ اس کا بچّہ
بیمار تھا۔ مگر سپاہی کا خوف اُسے عورت تک لے گیا۔ اُس
نے عورت سے کہا۔
"سنو۔ بچے کو چُپ کرو۔ سپاہی صاحب کی نیند
خراب ہو رہی ہے۔"

"میں تو چپ کر رہی ہوں" مگر کم بخت چپ ہوتا ہی نہیں"۔ عورت نے جواب دیا۔

"تو پھر چلی جاؤ یہاں سے سپاہی جی کہتے ہیں۔ سُنا" بھٹیارے کا دل یہ الفاظ کہتے ہوئے بھر آیا۔

"اس وقت کہاں جاؤں گی۔ میری طرف سے منت کے ساتھ کہدو کہ معاف کریں" عورت بولی۔

بھٹیارا ڈرتا ہوا آیا اور ساری حالت بیان کر دی۔ سپاہی کو غصہ آگیا اور وہ یہ کہتا ہوا اٹھا۔

"کم بخت نہیں مانتی۔ اچھا میں خود نکالتا ہوں۔ غصے کی حالت میں وہ اپنے کمرے سے نکل کر اُس کمرے میں آگیا جہاں عورت بچے کو لیے بیٹھی تھی۔ ۔۔۔ نے سپاہی کو دیکھ کر لمبا گھونگٹ کر لیا۔ سپاہی غصے میں گرج کر بولا۔

"کم بخت بچے کو چپ بھی نہیں کرتی اور یہاں سے دور بھی نہیں ہوتی"۔

"حضور۔ یہ بیمار ہے اور ضد کر رہا ہے۔ کیا کروں یہ سب میری قسمت کا کھیل ہے۔ مجھ پر رحم کیجیے۔ عورت یہ کہہ کر رونے لگی۔ سپاہی کو اور بھی غصہ آیا اور بولا۔

"بیمار ہے تو میں کیا کروں۔ اچھا نہیں ہوتا تو

زہر دے کر ختم کر دے دوسروں کو کیوں تکلیف دیتی ہے۔"

عورت نے بچے کو گودی سے الگ کر کے زمین پر بٹھا دیا اور رو کر بولی۔

"تو آپ ہی مار ڈالیئے ــــ میں کیسے مار سکتی ہوں ماں بچے کو مار نہیں سکتی۔ اُس کے لیئے مر سکتی ہے۔"

سپاہی غصے سے کانپنے لگا ــــ اور عورت کو پکڑ کر زور سے گھسیٹا ــــ بولا۔

"کم بخت جرح کرتی ہے ــــ"

عورت کے چہرے سے گھونگٹ گر گیا ــــ سپاہی ہکا بکا رہ گیا۔ یہ اس کی بیوی تھی۔ جلدی سے بچے کو زمین سے اٹھا کر لوریاں دے کر چپ کرنے لگا۔

(اس کہانی کا مرکزی خیال مسٹر جے نندر کمار کی ہندی کہانی سے لیا گیا ہے۔)
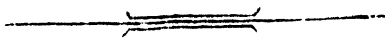
مُصنّف کی زندگی

رات کو زیادہ دیر تک کام کرنے کی وجہ سے خالد
نو بجے سو کر اٹھا۔ غسل کرنے کے بعد سائبان میں پڑی ہوئی آرام
کرسی پر بیٹھ گیا۔ ملازم نے چھوٹی سی میز لاکر بچھا دی۔ پھر معمولی سا
ناشتہ اور چائے کی پیالی لاکر رکھ دی۔ خالد نے وہ تولیہ ملازم کو
دے دیا جس سے اب تک سر کے بالوں کو سکھانے کی کوشش کر رہا تھا
ناشتہ ختم کرنے کے بعد اس نے اخبار کا
تازہ پرچہ اٹھا لیا۔ سرسری نظر سے اخبار دیکھتا اور ساتھ ہی چائے
پیتا جاتا تھا۔ چائے ختم کرتے کرتے اس نے سارے اخبار کو
سرسری نظر سے دیکھ لیا۔ چائے ختم کرکے اس نے سگریٹ جلایا
اور اخبار کی خبروں کو دل ہی دل میں دہرانے لگا۔ بہت سی
خبریں تھیں۔ ایک خبر کپڑے کے کارخانوں میں ہڑتال کی تھی۔
ہزار مزدوروں نے کام بند کر رکھا تھا۔ خالد آرام کرسی پر لیٹے

گیا۔ اور سوچنے لگا۔ ان غریب مزدوروں کی کیا زندگی ہے؟ دس دس بارہ بارہ روپئے ملتے ہیں۔ جو بال بچوں کے لیئے تو ایک طرف، اپنے لیئے بھی کافی نہیں ہوتے۔ اس پر بھی کارخانے کے کروڑپتی مالک ان کی مزدوریاں کم ہی کرنا چاہتے ہیں۔ خود کروڑوں روپے ہونے پر بھی زیادہ سے زیادہ جمع کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ وہ اپنی جگہ پر سوچا کرتے ہیں کہ اتنی دولت بھی اُن کے لیئے کافی نہیں۔ لیکن غریب مزدوروں کے لیئے دس بارہ روپیئے بھی زیادہ ہیں کہ کم کرنے کی فکر ہے۔ اُس کے دماغ میں ہڑتال اور ہڑتالی مزدوروں کی بیکار زندگی کا نقشہ کھینچ گیا۔ دیر تک سوچتا رہا کہ اس کھینچ تان کا خاتمہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ ہڑتال ہو گئی۔ اس سے مالکوں کو نقصان بھی ہوا لیکن اگر وہ بھی ضد میں آ کر دو چار مہینے کارخانہ بند رکھیں تو ان کا کیا نقصان ہوگا پچاس ہزار یا ایک لاکھ کا نقصان۔ لیکن اتنے دنوں میں مزدوروں کا تو کام تمام ہو جائے گا۔ ان کے بال بچے تو بھوکوں مر جائیں گے لیکن نہیں۔ صرف یہی علاج ہے۔ اتنے آدمیوں کا فاقہ کرنا معمولی بات نہیں۔ تجارت کا رنگ بدل جائے گا۔ کارخانے کے مالک کی حیثیت ہی بدل کر رہ جائے گی۔ ہڑتال کا جاری

رہنا ہی اس کا علاج ہے۔ آخر میں اُس نے فیصلہ کیا کہ ہڑتال کو سامنے رکھکر ایک کہانی لکھے گا۔

اتنے میں ایک بھونرا اڑتا ہوا، خالد کے کان کے پاس ہوکر نکلا۔ اور گملوں میں رکھے ہوئے پودوں کے چاروں طرف گھوم کر ایک پودے پر بیٹھ گیا۔ خالد اس کو دیکھنے لگا اس کے دماغ میں بہت سی باتیں آئیں اور نکل گئیں۔ بہت سی پرانی کہانیاں آئیں۔ جن میں بھونروں کا تذکرہ تھا۔ کچھ تو تو اُس نے بچپن میں سنی تھیں۔ اور کچھ کتابوں میں پڑھی تھیں لیکن پھر اس کا دماغ ہڑتال، ہڑتالی مزدور اور اُن کی دکھ بھری زندگی میں کھوکر رہ گیا۔

نہ جانے وہ کتنی دیر تک اپنے خیال میں کھویا رہتا۔ لیکن مکان کا مالک آگیا اور بولا:۔

"دو مہینے ہوگئے ہیں۔ اب کرایہ مل جاتا تو اچھا ہوتا۔ مجھے بھی ضرورت ہے۔"

خالد نے جواب دیا:۔

"ہاں۔ دو چار روز اور ٹھہر جائیے۔ دونوں مہینے کا کرایہ ایک ساتھ دیدوں گا۔"

مالک نے کہا:۔

"ذرا خیال رکھئے گا۔ روپیوں کی بہت ضرورت ہے"

مکان کا مالک چلا گیا۔

خالد نے پھر اخبار اٹھایا اور پڑھنے لگا۔ لیکن اس کی طبیعت نہ لگی۔ وہ سوچنے لگا۔ اتنا سا مکان اور پندرہ روپیہ کرایہ۔ بلکہ مکان کہنا ہی غلط ہے۔ صرف دو کمرے ہیں کرایہ کتنا زیادہ ہے اس پر بھی مکان کے مالک صاحب فرماتے ہیں "آپ کی وجہ سے کم کردیا ہے" نہ جانے اب دو سو روپئے ماہوار ان کو ملتے ہیں شاید اس مکان کو چھوڑنا ہوگا۔ کرایہ کم کرنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اور احسان جتاتا جاتا ہے۔ مگر پھر فوراً ہی اس کا خیال بدل گیا۔ دو کمرے تو ضرور ہیں۔ لیکن دونوں بڑے ہوا دار اور آرام کے کمرے ہیں۔ مجھے اور زیادہ کی ضرورت ہی کیا ہے؟ سائبان بھی ہے۔ اور تھوڑا سا صحن بھی۔ دوسرا مکان اتنے میں کہاں ملے گا۔ پھر ایک زمانے سے اس میں ہوں۔ اب کہاں جاؤں، میرے لیئے بہت اچھا ہے۔

وہ اِن خیالوں میں نہ جانے کب تک الجھا رہتا مگر اس کا ملازم ڈاک لے کر آگیا۔ خطوں اور رسالوں کا اچھا خاصا پلندا تھا۔ اُس نے ایک خط کھولا۔ لکھا تھا:۔

محترمی

آپ کی بھیجی ہوئی کہانی "بیوہ" مل گئی۔ اگلے مہینے کے رسالے میں چھپے گی۔ یہ کہانی کسی رسمی تعریف کی محتاج نہیں ہم اس کہانی کو چھاپ کر فخر کر سکیں گے لیکن میں شرمندہ ہوں کہ اب تک پہلا روپیہ بھی نہ بھیج سکا۔ امید ہے کہ اگلے ہفتے میں کُل روپیہ بھیج سکوں گا۔

ایڈیٹر.........

خط کو پڑھ کر اُس نے رکھ دیا۔ اور سوچنے لگا۔ اسی روپیئے کی امید پر مکان کے مالک سے دو چار دن کا وعدہ کر لیا۔ اب کیا ہوگا؟ یہ بار بار وعدہ کرتے ہیں۔ لیکن روپیہ نہیں بھیجتے۔ آخر یہ سلسلہ کب تک چلے گا! اور پبلشروں نے کام بالکل ہی بند کر دیا ہے۔ کوئی کتاب لکھواتا ہی نہیں۔

اُس نے دوسرا خط کھولا۔ لکھا تھا:۔

مکرمی

مجھے نواب صاحب امیر پور نے حکم دیا ہے کہ آپ کو یہ خط لکھوں۔ اور یہ خوش خبری دیدوں کہ حضور نواب صاحب کے ایک دوست نے آپ کا

نیا ناول "ملاپ" انھیں دیا تھا۔ وہ پڑھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور سرکاری خزانے سے آپ کا دو سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دینے کا حکم دیا ہے۔ یہ وظیفہ آپ کو نومبر سے ملنا شروع ہوگا۔ اگر آپ کو فرصت ہو تو تشریف لائیے۔ نواب صاحب آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔

آپ کا خیر خواہ
پرائیوٹ سکریٹری
نواب بہادر امیر پور

خالد کو یہ خط پڑھ کر کچھ تو خوشی ہوئی اور کچھ رنج ہوا۔ خوشی اس لیئے کہ دو سو روپیئے ماہوار کی آمدنی ہوگئی اور رنج اس لیئے ہوا کہ ایک رئیس کی جانب سے مدد تھی۔ اُس نے سوچنا شروع کیا کہ۔ یہ تو صحیح ہے کہ زمانہ ترقی کر چکا ہے۔ لیکن بعض لحاظ سے اب بھی وہیں ہے۔ جہاں سو برس پہلے تھا۔ یعنی تعلیم تو بڑھ گئی ہے۔ مگر تعلیم کا نتیجہ وہی ہے۔ جس طرح پہلے کے ادیب رئیسوں کے وظیفوں اور اُن کی روٹیوں پر زندگی گزارتے تھے۔ اُسی طرح آج کے ادیب بھی مجبور ہیں۔ اگر ادیبوں کی کتابیں ہزاروں ہزار کی تعداد میں چھپ کر

بک جایا کرتیں۔ تو اُن کو کافی آمدنی ہو جایا کرتی۔ کسی رئیس کا وظیفہ کیوں قبول کرنا پڑتا۔ اور ان رئیسوں کی مہربانی ہی کیا؟ نہ جانے اس ناول کی کون سی بات ان کو بھلی معلوم ہوئی۔ وظیفہ مقرر ہو گیا۔ دوسرے ناول کی کوئی بات بری معلوم ہوگی بند ہو جائے گا۔ لیکن نواب صاحب کو اس ناول کی کون سی بات پسند آئی؟ ہاں اس میں کسانوں اور زمینداروں کی لڑائی کے بعد دونوں کا ملاپ ہے۔ یہی بات نواب صاحب کو پسند آئی ہوگی۔ لیکن نواب صاحب سمجھے نہیں۔ دراصل جیت کسانوں ہی کی ہوئی ہے۔ زمینداروں کو جھکنا پڑا ہے۔ مگر نواب صاحب اس کی تہ کو نہ پہنچ سکے۔ وہ اسی سے خوش ہو گئے کہ میل ہو گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ آج کل کے نئے لکھنے والے جوش کو آخری حد تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس سے ان رئیسوں کو اُن سے نفرت ہو جاتی ہے۔ میں نے یہ نہیں کیا۔ بلکہ ایک واقعہ کی تصویر کھینچ دی ہے۔ زمیندار روز روز کی کھینچ تان سے گھبرا کر، اور کسان یہ سمجھ کر کہ وہ زیادہ دنوں تک تحریک کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ ملنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ تو دراصل کسانوں کی مجبور زندگی

کی تصویر ہے ۔ وہ جائز حق کے لیئے لڑتے ہیں ۔ مگر طاقت نہ ہونے کی وجہ سے پھسل جاتے ہیں ۔

خالد کو کچھ تکلیف ہوئی ۔ اس کے ناول کی صحیح داد یہ نہ تھی ۔ صحیح داد یہ ہوتی کہ نواب صاحب رنجیدہ ہوتے بلکہ ریاست میں ناول کی بکری کو منع کر دیتے اس نے خط کو میز پر رکھ دیا ۔ اور جیب سے دوسرا سگریٹ نکال کر جلایا ۔ اور دل ہی دل میں بولا ۔ یہ دنیا بھی کتنی عجیب جگہ ہے ۔ دولت انہیں کے پاس ہے ۔ جن کے دماغوں میں کوڑا بھرا ہے ۔ اسی لیئے تو آج بے کاروں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے ۔ ہزاروں پڑھے لکھے گلیوں کی خاک اڑاتے پھرتے ہیں ۔ ان میں بعض ایسے ہوں گے جو بہترین دماغوں کے مالک ہوں گے ۔ مگر ان کی کوئی قیمت نہیں ۔ قیمت ہے تو سیٹھوں کی توند کی ۔ کیونکہ ان کے پاس روپیہ ہے ۔۔۔۔۔۔

وہ اپنے انہیں خیالوں میں الجھا ہوا تھا ۔ کہ سڑک پر موٹر آکر رکی اور ایک موٹا تازہ آدمی اتر کر خالد کے پاس آیا ۔ صاحب سلامت ہوئی ۔ اور دونوں بیٹھ گئے ۔ یہ سیٹھ عبدالکریم "قومی کتاب گھر" کے مالک

تھے - سیٹھ صاحب ہنستے ہوئے بولے :-

" خالد صاحب ! آپ کا ناول " طلاپیا " بہت پسند کیا گیا - آج نواب صاحب امیر پور کے پرائیوٹ سکریٹری کا خط اس کی تعریف میں آیا ہے - اور ہاں پہلے پانچسو چھپوایا تھا - سب بک گیا - پھر چھپوا رہا ہوں - گر آپ سے کہنے آیا ہوں کہ ایسا ہی کوئی دوسرا ناول جلد ہی لکھ دیجئے - نواب صاحب کا بھی حکم ہے کہ آپ کا ہر ناول اُن کی خدمت میں بھیج دیا جائے - "

خالد نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لگا کر کہا :-

" سیٹھ صاحب ! ان رئیسوں کی تعریف ہی کیا - مصاحبوں نے کہا - حضور بہت اچھا ناول ہے نواب صاحب نے کہا بے شک - لیکن مصاحبوں نے اگر کہہ دیا خراب ہے تو بس خراب ہو گیا - خیر چھوڑیئے ان باتوں کو - اب سنئے ناول تو میرے پاس دو دو تیار ہیں - اور ایک میرے دماغ میں چکر لگا رہا ہے - میں تیار ہوں - جب جی چاہے - آپ لے سکتے ہیں "

سیٹھ صاحب ہنستے ہوئے بولے :-

" آج ہی صاحب ! آج ہی - اس میں

دیر کرنے کی کیا بات ہے؟ بس آج ہی دفتر میں تشریف لائیے۔ ساری باتیں طے ہو جائیں گی۔ مگر خالد صاحب آج میں ایک اور پروگرام لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ ایسا کیوں نہ کیجیے۔ میں روپیہ لگاؤں اور آپ ایک ماہوار رسالہ مرتب کریں۔ جو نفع ہو اس میں دونوں کا برابر حصہ ہو۔ مجھے تو یقین ہے کہ آپ کے نام سے رسالہ ہزاروں کی تعداد میں نکل جائے گا۔"

"مگر سیٹھ صاحب" ! خالد نے کہا "میں آج کل دماغی لحاظ سے پریشان ہوں۔ کل کی امید پر آج کام کرنے کا موقع میرے لیئے نہیں ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ میں تنخواہ لوں اور رسالہ ترتیب دید یا کروں۔"

"ہاں ہے تو ٹھیک"۔ سیٹھ صاحب بولے

"لیکن آپ جانتے ہیں کہ رسالہ فوراً ہی نہیں چل پڑے گا سیکڑوں روپیہ مہینے کا خرچ تو رسالے پر ہوگا۔ پھر آپ کی تنخواہ۔ مجھ پر بہت زیادہ بوجھ ہو جائے گا میں نے اسی لیے تو یہ رائے دی کہ بوجھ دونوں پر برابر پڑے ـــــــ خیر آپ دفتر میں تو آئیے۔ باتیں ہو جائیں گی۔"

سیٹھ صاحب چلے گئے۔ خالد کو اطمینان ہوا

اب سارا سامان ہو جائے گا۔ زندگی میں کچھ آرام بھی نصیب ہوگا۔ دو سو روپیہ نواب صاحب کے یہاں سے۔ لیکن یہ تو جولائی کا مہینہ ہے۔ نومبر سے ملے گا۔ جولائی۔ اگست ستمبر، اکتوبر۔ یعنی چار مہینے بعد سے۔ خیر چار مہینے کسی طرح کٹ ہی جائیں گے۔ جب تک سیٹھ صاحب سے روپیے کا انتظام ہو جائے گا۔ اگر رسالہ صرف اُن کا رہا تو پھر تنخواہ کچھ نہ کچھ ملے گی ہی۔ اور دوسرے رسالے بھی ہیں ہی۔

اُس نے ایک رسالے کا پیکٹ کھولا۔ اس میں اس کے لیئے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ رکھ دیا۔ دوسرا کھولا۔ اس میں بھی کچھ نہ تھا۔ تیسرا کھولا۔ اُس کی ایک کہانی چھپی تھی۔ اور ساتھ ہی تعریف بھی۔

رسالے کو رکھ کر اُس نے ایک خط کھولا۔ ایک دوست کا خط تھا۔ اُس نے اپنی مصیبتوں کی داستان لکھ کر کچھ مدد چاہی تھی۔ خالد کا دل بھر آیا مگر کیا کرتا۔ دل میں درد بہت زیادہ تھا۔ مگر جیب میں پیسے نہ تھے۔ سوچنے لگا۔ سیٹھ صاحب سے لے کر اس کو کچھ بھیج دیا جائے۔ اُس کو اطمینان ہوا۔ سیٹھ صاحب سے روپیہ

ضرور ہی مل جائے گا۔

اس نے اور خطوں کو بھی دیکھا۔ مگر کوئی خاص بات نہ تھی۔کسی میں مضمون کی فرمائش تھی۔کہیں سے دعوت دی گئی تھی۔کسی خط میں تعریف۔

اُس نے نواب صاحب امیر پور کے پرائیوٹ سکریٹری کو شکریہ کا ایک خط لکھا۔بعض دوسرے خطوں کے جواب لکھے۔اتنی دیر میں دو بج گئے۔ وہ اٹھا۔اور سیٹھ صاحب کے یہاں روانہ ہوگیا۔

سیٹھ صاحب دفتر میں خوب میٹھی میٹھی باتیں کرتے رہے۔ اور دیر تک رسالے کا پروگرام بنتا رہا۔لیکن ایک شرط اپنی جگہ پر رہی۔یعنی نفع میں آدھے کے شریک تنخواہ کچھ نہیں۔بڑی دیر کے بعد خالد نے اس کو بھی منظور کرلیا۔ہاں ایک شرط ضرور ہوگئی۔ اور وہ یہ کہ سیٹھ صاحب ہر دوسرے مہینے ایک ناول لیا کریں گے۔خالد نے سوچا کہ اس سے بھی کام چل جائے گا۔

آخر خالد کو دوست کی مصیبت یاد آگئی اور اُس نے سیٹھ صاحب سے کچھ روپیہ طلب کیا۔

سیٹھ صاحب نے منھ بنا کر کہا۔

"خالد صاحب! آپ سے کوئی تکلف نہیں ہے۔ اس لیے صاف کہے دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ پہلے روپیہ دینے میں بہت نقصان ہے۔ میں آپ کو پہلے روپیہ برابر دیا کرتا تھا لیکن اب میں نے پکا ارادہ کرلیا ہے کہ پہلے کسی کو بھی روپیہ نہ دوں گا۔ اس لیے شرمندہ نہ کیجیے۔ آپ کے دونوں ناول چھپ جائیں۔ پھر مجھ سے پانچ سو روپیہ لے لیجیے۔ پھر پیچھے حساب ہوتا رہے گا۔"

خالد کو اس جواب کی بالکل امید نہ تھی کبھی کبھی وہ سیٹھ صاحب سے پہلے بھی روپیے لے چکا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ کچھ دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر بولا:۔

"آپ پکا ارادہ کر چکے ہیں تو کچھ کہنا ہی فضول ہے۔"

اور اپنے گھر روانہ ہوگیا۔ راستہ بھر طرح طرح کے خیالات اس کے دماغ میں آئے اور نکل گئے۔ کبھی وہ سوچتا کہ دونوں ناول اس سے چھین کر لے آئے۔ کبھی خیال آتا کہ جا کر اُس سے خوب لڑے۔ مگر اُس نے کچھ نہ کیا۔ اور گھر چلا آیا ——— آتے ہی ملازم نے ایک تار لا کر دیا

اور بولا۔

"ابھی آیا ہے۔ دستخط کر کے لے لیا۔"

خالد نے تار کھولا۔ لکھا تھا:۔

"نواب صاحب نے آپ کا ناول "آگ" پڑھا۔ بہت خفا ہوئے۔ وظیفے کا حکم نامہ واپس لے لیا۔ اب آپ کے یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔"

پرائیوٹ سکریٹری

نواب بہادر امیر پور

خالد آرام کرسی پر لیٹ گیا اور اُس کے دماغ میں نئے ناول "ہڑتال" کا پلاٹ چکر کاٹنے لگا۔

بھائی

رات آدھی سے زیادہ جا چکی تھی۔ مگر پربھا اور سریندر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ سریندر ابھی ایک مجرم کو تین سال کی سزا دینے کا فیصلہ لکھ کر اٹھا تھا۔ پربھا کہہ رہی تھی "دنیا میں جتنی بھی برائیاں ہیں، اس کی وجہ اکثر وہی لوگ ہیں جو ان برائیوں کی مذمت کا نقارہ بجایا کرتے ہیں ان برائیوں کا ارتکاب اگر کوئی کرتا ہے تو مجبوری کی حالت میں۔ ورنہ وہ اُسے خود بھی پسند نہیں کرتا" پربھا اسی قسم کی باتیں کرتی جاتی تھی۔ اور سریندر کہہ رہا تھا۔ تم تو گاندھی جی کی انداز میں باتیں کرتی ہو۔ میں مجسٹریٹ ہوں۔ ہر روز چوروں بدمعاشوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ لیکن مجھے کبھی اس کا احساس نہیں ہوا" جب پربھا سریندر کی خشک باتوں سے گھبرا جاتی تو کہتی آپ باتوں میں ٹال رہے ہیں" سریندر کہتا

"میں تو دن بھر کچہری میں سر مارتا ہوں۔ یا قانون کی کتابوں میں
تم روز روز نئی کتابیں پڑھتی ہو اور سوچتی ہو۔ مجھے ان باتوں
پر سوچنے کی فرصت کہاں"۔ مگر پربھا باتوں کا سلسلہ بڑھاتی ہی
جاتی تھی۔

آخر سریندر کو نیند آنے لگی، اور وہ کرسی سے
اُٹھ کر مسہری پر لیٹ گیا۔ پربھا چاہتی تھی کہ اُس نے جو
کچھ بھی سوچا ہے، سریندر اس کی تصدیق کر دے۔ اسی
لیئے نہ وہ خود سوتی تھی اور نہ سریندر کو سونے دیتی تھی
اگر وہ پربھا کی باتیں سنتے سنتے اونگھنے لگتا تو کسی نہ کسی طرح
جگا دیتی تھی۔ آخر سریندر نے کہہ دیا۔

"دن بھر کا تھکا ہوں۔ مجھے سونے دو"۔
پربھا نے روٹھی سی آواز بنا کر کہا۔
"دیکھئے رات کیسی کالی ہے۔ مجھے نیند نہیں
آتی اور اکیلے ڈر لگتا ہے"۔

سریندر کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ وہ جانتا تھا
کہ پربھا کی شرارت ہے۔ ورنہ پربھا اور ڈر! اُس نے پربھا
کو بھی کھینچ لیا۔ مگر وہ یہ کہتی ہوئی مسہری سے اٹھ گئی کہ پیاس
معلوم ہو رہی ہے۔ صراحی سائبان کی منڈیر پر رکھی تھی و

باہر چلی آئی۔ کالے آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ وہ آسمان کو دیکھتی رہی۔ یکایک اُسے کسی کے پاؤں کے چاپ کی آواز سنائی دی۔ وہ سمجھی کہ سریندر اُسے ڈرانے آیا ہے اس نے پلٹ کر دیکھا۔ کوئی سیڑھی پر کھڑا تھا۔ پربھا کے مڑتے ہی وہ سیڑھی سے اُترنے لگا۔ پربھا کو یقین ہوگیا کہ سریندر نہیں ہے۔ کوئی دوسرا آدمی ہے۔ اس کے کپڑے بھی میلے ہیں۔ وہ ڈر کر چلّا اُٹھی۔

وہ آدمی گھبرا کر بھاگا۔ اُس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ لڑھکتا ہوا سیڑھی سے نیچے جا گرا، سریندر اور نوکر بھی آپہونچے اور اسے مارنا شروع کیا۔ چور کے سر میں سخت چوٹ آئی تھی۔ خون بہہ رہا تھا۔ پربھا بھی کانپتی ہوئی نیچے پہنچی۔ بجلی کی تیز روشنی میں اُسے دیکھا اُس کے پھٹے اور میلے کپڑے خون میں تر تھے۔ سریندر نے نوکروں سے کہا۔

"لے جاؤ بدمعاش کو تھانے میں"

نوکر اُسے لے جانے لگے۔ چور نے نہ تو کھینچا تانی کی اور نہ کچھ بولا وہ چپ چاپ رہا۔ اُس کی آنکھ سے آنسو بہہ رہے تھے۔ مار پیٹ اور سینکڑوں سوالات

کے جواب میں وہ برابر روتا رہا۔ آخر نوکر اُسے لے جانے لگے جیسے ہی وہ تین چار قدم آگے گیا۔ پربھا جیسے یکایک چونک پڑی اور بولی۔

"اب تو اسے کافی سزا مل چکی۔ تھانے نہ بھیجیے۔"

سریندر نے مڑکر پربھا کو دیکھا اور بولا۔

"پربھا! دیا ایسے چنڈالوں پر نہیں کی جاتی۔"

پربھا بولی۔

"نہیں مت بھیجیۓ دیا کرنا ہر حال میں اچھا ہے۔کسی کے ساتھ بھی کیوں نہ ہو۔"

سریندر نے چڑ کر کہا۔

"تم تو عجیب آدمی ہو۔ ایسے چنڈالوں کے ساتھ بھی دیا ہوتی ہے کہیں۔"

پربھا نے سریندر کے پاس جاکر کہا۔

"ہاں۔"

وہ اور آگے بڑھی۔ اور چور کا ہاتھ پکڑ کر بولی "آؤ بھائی"۔ اور کوٹھے پر لے آئی۔ ایک نوکر سے پانی منگایا اس کا سر دھویا۔ پٹی باندھی۔ سریندر کے دھلے کپڑے نکال کر

پہنائے ۔ دودھ منگاکر پلایا ۔ سریندر سارا تماشا دیکھتا رہا ۔ پربھا نے چور سے بڑی محبت سے کہا ۔

"چوری کرنا بڑی بُری بات ہے بھائی! اب کبھی چوری نہ کرنا ۔"

چور نے سر اٹھایا ۔ پربھا کو دیکھا اور سر جھکالیا

پربھا کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی ۔ اُس نے ایک کمرے میں چور کو سونے کے لیئے آرام کی جگہ دی ۔ کمرہ بند کرتی آئی ایسا نہ ہو کہ رات کو اٹھ کر روانہ ہو جائے ۔

سریندر بہت خفا تھا ۔ لیکن پربھا سے اس کو اتنی زیادہ محبت تھی کہ کچھ نہ کہہ سکتا تھا ۔ چور تو خیر آدمی ہی تھا ۔ اگر وہ کُتّے کو بھی اُس کے کپڑے پہنا دیتی اور مسہری پر سلا دیتی تو وہ کچھ نہ بولتا ۔ مگر جب پربھا اُسے سُلا کر واپس آئی تو وہ چُپ نہ رہ سکا ۔ اس نے کہا ۔

"پربھا کبھی تم بچّی کی طرح کام کرتی ہو ۔ اگر اس چنڈال پر ایسی ہی دیا آگئی تھی تو چھوڑ دیتیں ۔ مگر تم نے اس کی سیوا کی اور گھر میں رکھا ۔ یہ کہاں کی عقلمندی ہے جو ہمارا گھر لوٹنے آئے اُس کے ساتھ مہربانی......"

پربھا ہنستی ہوئی لیٹ گئی ۔ سریندر کی گردن

میں باہیں ڈال کر بولی۔

"آپ تو بیکار ہی دکھی ہوتے ہیں۔ اگر میرا یا آپ کا بھائی ایسا ہو جاتا تو اُسے تھانے بھیج دیتے۔ یا اُسے اچھا آدمی بنانے کی کوئی ترکیب کرتے...... !؟

سریندر نے بات کاٹ کر کہا۔

"بس تمہیں ہمیشہ ایسی ہی باتیں سوجھتی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ تم اُسے بالکل سادھو بنا دوگی۔"

پربھا ہنسنے لگی اور بولی۔

"آپ شرط بدتے ہیں؟ دیکھیئے میں اسے ایسا اچھا آدمی بنا سکتی ہوں کہ آپ بھی تعریف کرنے پر مجبور ہو جائیں آپ ذرا یہ سوچیئے کہ اس نے چوری کرنے کی کیوں ٹھانی؟ یہ برائی اس میں کہاں سے آئی؟ کوئی بُرا پیدا تو نہیں ہوتا؟ ہاں حالات بُرا بنا دیتے ہیں۔ اگر حالات کو درست کر دیا جائے تو بگڑا ہوا آدمی اچھا کیوں نہیں بن سکتا؟ اس سے اچھی بات اور کیا ہو گی اگر ایک بگڑا ہوا آدمی سُدھر جائے۔"

سریندر نے پربھا کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"پربھا، سچ مچ کتابیں پڑھنے کا فائدہ تم نے اٹھایا ہے۔ میں تو بس روپیہ کمانے کی مشین بن کر رہ گیا ہوں

تم یہ باتیں مجھ سے تو فضول ہی کرتی ہو۔ ایسی باتیں تو تم گاندھی جی کے آشرم میں کرتیں تو اچھا معلوم ہوتا۔ خیر اب میں کچھ نہ بولوں گا۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ چنڈال کبھی آدمی نہ بنے گا تم آزما دیکھو۔"

پربھا سریندر سے اور بھی قریب ہوگئی۔ کمرے میں سبز رنگ کا بلب جل رہا تھا۔ اور دریچے سے تاروں بھرا نیلا آسمان نظر آرہا تھا۔ پربھا دیر تک چور کے متعلق سوچتے سوچتے سوگئی۔

(۲)

صبح ہوئی تو پربھا چور کے کمرے میں گئی۔ وہ اب تک سو رہا تھا۔ جا کر اُسے اٹھایا۔ چور گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا پربھا بولی۔

"زیادہ دیر تک نہیں سونا چاہیئے"

چور شرما گیا۔ اس نے نظر پھرا کر کمرے کی ہر چیز کو دیکھا۔ ایک طرف سنگار میز پر بڑا سا آئینہ رکھا تھا۔ اُس نے اپنی صورت اس آئینے میں دیکھی۔ اب تک اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنے سر کو ٹٹولا۔ پربھا پر اس کا بڑا گہرا اثر ہوا۔ اُس نے کہا۔

"بھائی تمہیں چوٹ زیادہ آگئی ہے۔ ابھی آرام کرو۔"

پربھا دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ سریندر دس بجے کھانا کھا کر آفس چلا جایا کرتا تھا۔ پربھا صبح اٹھتے ہی اس کی ساری ضرورت کی چیزیں مہیا کر دینے کی عادی تھی۔ چور کو کمرے میں چھوڑ کر وہ سیدھی نیچے دیکھنے آئی کہ ناشتہ وغیرہ تیار ہوا ہے یا نہیں۔ باہر کے کمرے میں ایک نوکر سریندر کے چپراسی سے کہہ رہا تھا۔ بھائی ایشور کی لیلا بھی نرالی ہے۔ ہمارے صاحب بہادر تو ہر روز چور اچکوں کو بڑے گھر بھیجا کرتے ہیں۔ اور رات گھر میں چور گھسا تو بائی نے اُسے تھانے جانے نہیں دیا۔ بلکہ اُسے چوٹ آگئی تھی تو مرہم پٹّی بھی اپنے ہاتھوں سے کی اور اُسے آرام سے رکھا۔"

چپراسی نے جواب دیا۔ ایشور کی لیلا ہی ہے بھائی ہمارے صاحب دیوتا ہیں اور بائی جی دیوی ہیں دیوی۔ ہم لوگ تین ٹکے کے آدمی ہیں، اور وہ کبھی نام لے کر نہیں پکارتی ہیں۔ تم کو اُس دن کی بات یاد ہوگی صاحب کے ایک دوست نے ہم کو، اے چپراسی

کہہ کے بلایا۔ تو انہیں سمجھانے لگیں۔ بولیں "غریب مگر شریف آدمی ہے۔ چپراسی جی کہہ کر بلائیے" بھلا اتنا کس کو خیال رہتا ہے ...."

پربھا کے پاؤں کی چاپ سن کر دونوں چپ ہو گئے۔ نیچے اترتے ہی اس نے چپراسی اور نوکر کو بلا کر کہا۔

"دیکھو کوئی آدمی اس سے کچھ ایسی بات نہ کہے کہ اس کو تکلیف ہو"

دونوں سمجھ گئے کہ ہماری باتیں پربھا نے سُن لیں۔ چپراسی جی میں خوش ہو گئے کیونکہ وہ تعریف کر رہے تھے۔ اندو لال ڈر گیا کیونکہ ایک طرح وہ پربھا کی شکایت کر رہا تھا۔ مگر پربھا پر نہ تو چپراسی کی تعریف کا کوئی اثر ہوا اور نہ اندو لال کی شکایت کا۔ وہ سیدھی رسوئی گھر میں پہنچی۔ وہاں رسویا کو بھی یہی بات سمجھائی اور ہر نوکر کو جب اسے یقین ہو گیا کہ ہر چیز وقت پر مل جائیگی تو وہ پھر اوپر آئی۔ سریندر ڈاڑھی بنانے کو صابن لگا چکا تھا۔ پربھا کو جیسے ہی دیکھا اُٹھ کر اس کے پاس آیا اور بولا۔

"چلو ذرا نئے دوست کو دیکھتے آئیں"

دونوں ہنس پڑے۔ پربھا سریندر کو لیئے ہوئے
اُس کمرے میں پہنچی جہاں چور تھا۔ وہ مسہری کے ایک کونے
پر بیٹھا ہر چیز کو حیرت اور خوف بھری نظروں سے دیکھ رہا
تھا۔ ان دونوں کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سریندر
نے کہا۔

"یار ہو قسمت کے سانڈ۔ اگر میرے اُجلاس
پر چوری کر کے آتے تو کم سے کم چھ مہینے کے لیے بھیج دیے
جاتے۔ لیکن آئے تو گھر میں، جہاں پربھا دیوی رہتی ہیں۔ ہر
بہن کے یہاں بھی چوری کرنے جاتے تو سونے کو مسہری
نہ ملتی۔ یہ تو بہن سے بھی زیادہ نکلیں۔"

چور نے شرم سے گردن جھکالی۔ اُس نے
جھکی ہوئی نگاہوں سے سریندر اور پربھا کو دیکھا۔ اُس کی
آنکھ سے آنسو بہہ نکلے۔ پربھا سریندر سے بولی۔
"جائیے ڈاڑھی بنا کر جلدی اشنان کر لیجیے
ناشتہ تیار رہے۔"

سریندر ہنستا ہوا چلا گیا۔ چور اب تک نگاہیں
نیچی کیئے کھڑا تھا۔ اس کے دل اور دماغ میں احساسات
اور خیالات کا طوفان امنڈا آرہا تھا۔ بہت سے خیالات

یکے بعد دیگرے تیزی سے اس کے دماغ میں آرہے تھے۔ جیسے ریل کے ٹھہرتے ہی تیسرے درجے کے ڈبے میں مسافر۔ کبھی اس کا دل چاہتا تھا کہ دوڑ کر پربھا کے پاؤں پر سر رکھدے۔ کبھی دل چاہتا تھا کہ بھاگ جائے۔ اگر اس وقت زمین پھٹ جاتی تو وہ خوشی سے اس میں سما جاتا۔ مگر پربھا سے وہ آنکھ ملانا نہیں چاہتا تھا۔ پربھا کی مہربانی کے بدلے اگر وہ اس وقت پولیس کی سختیوں میں ہوتا تو زیادہ سکون محسوس کرتا۔

پربھا نے چور کے دل اور دماغ کی کیفیت کا عکس اس کے چہرے پر دیکھا۔ اُسے یقین ہوگیا کہ وہ عادی مجرم نہیں ہے۔ کوئی بدحال ہے اور مصیبت سے تنگ آکر اس نے چوری کرنے کی ٹھانی تھی۔ اس لیئے تھوڑی سی کوشش میں اُسے اچھا آدمی بنایا جاسکتا ہے۔ اسے اس خیال سے بڑی خوشی ہوئی۔ وہ اپنی خیالی کامیابی پر مسکرانے لگی۔ وہ خیالات کے بہاؤ میں دور تک پہنچ گئی۔ اپنے خیالات کی دنیا میں چور کو اس نے ایک شریف نیک اور ہونہار آدمی کی شکل میں دیکھا۔ دیر تک وہ انہیں خیالات میں الجھی رہی اور نہ جانے کب تک الجھی رہتی کہ سریندر کی آواز اس کے

کانوں میں آئی۔

"شریمتی جی!"

پربھا چونک پڑی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔

سریندر سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ پھر اُس نے چور کو دیکھا وہ گردن جھکائے اسی طرح کھڑا تھا۔ اس کا اثر اُس پر اور بھی زیادہ ہوا۔ وہ چور کے پاس گئی اور بولی۔

"دیکھو بھائی۔ زیادہ شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ غلطی آدمی سے ہی ہوتی ہے۔ تم صرف پکّا ارادہ کرلو کہ تم اچھے آدمی بنوگے۔ مجھے تو ابھی سے یقین ہے کہ تم اچھے آدمی ہو اور ہمیشہ رہوگے بھی۔"

سریندر نے پھر کہا۔

"پربھا! اگر تمھارا بھائی بھی آتا تو شاید تم اتنی خاطر نہ کرتیں.........."

پربھا نے پلٹ کر جواب دیا۔

"میرا ہی بھائی ہے۔"

سریندر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ارے آج میں آفس جاؤں گا یا نہیں کچھ کھانے کو بھی ملے گا یا نہیں؟"

پربھا مسکرائی ۔ اُس نے نوکر کو پکارا

"اندو لال"

اندو لال آیا ۔ پربھا نے اُس آدمی کو اُس کے ساتھ کر دیا کہ اُسے ہاتھ منہ دھو کر کچھ کھلائے پلائے ۔ پھر ہسپتال لے جا کر مرہم پٹی کرا لائے ۔ اندو لال اُسے لیکر چلا گیا پربھا سریندر کے پاس آکر بیٹھ گئی ۔ نوکر چائے ناشتہ لایا ۔ دونوں بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگے ۔ سریندر نے پربھا کو چھیڑنے کے لیئے کہہ دیا ۔

"پربھا تم کو راکھہ ہیں گھی سکھانا خوب آتا ہے یاد ہے تم کو ۔ ایک بھیک مانگنے والی چھوکری کو تم نے رکھا تھا ۔ آخر وہ بھاگ گئی ۔ جس کو کوئی بری عادت پڑ جاتی ہے وہ کسی طرح بھی نہیں چھوٹتی

پربھا اپنی عادت کے موافق مسکرا کر بولی ۔

"آپ کا کہنا شاید صحیح ہو ۔ لیکن ہمارے اور آپ کے خیالات میں بڑا فرق ہے ۔ آپ مجسٹریٹ ہیں ۔ صرف سزا دینا جانتے ہیں ۔ لیکن کبھی کسی کو سُدھارنے کی کوشش نہیں کرتے ۔"

سریندر نے قہقہہ لگایا اور جواب دیا ۔

"شاباش۔ مجھ پر تو ایک طرف۔ تم نے سارے مجسٹریٹوں پر ایک مستقل الزام رکھ دیا۔ تو تم یہ چاہتی ہو کہ ہم لوگ بھی تمھاری طرح سارے چور اُچکے اور بدمعاشوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آئیں"۔

پربھا بحث کرنے کو ہر وقت ہی تیار رہتی تھی اب وہ چپ کیسے رہتی۔ وہ خود ہی ہر بات پر سریندر سے بحث کرنا چاہتی تھی۔ سریندر ہی ان بحثوں میں حصّہ لینے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ پربھا اس موقع کو کب چھوڑنے والی تھی فوراً ہی بولی۔

"نہیں میرا مطلب یہ نہیں کہ آپ سب کے ساتھ مہربانی سے پیش آئیں۔ مگر آپ لوگ یہ کبھی نہیں دریافت کرتے کہ آخر جرائم کن حالات کے ماتحت ہوا کرتے ہیں۔ اگر حکومت سزائیں دینے کے بدلے اس قسم کی تحقیقات کرے اور انھیں بدلنے کی کوشش کرے تو میرے خیال میں زیادہ بہتر صورت حال پیدا ہو جانے کی اُمّید ہے۔

"میں تو قانون کے ماتحت سزا دینا جانتا ہوں مجھے اس کا اختیار ہی نہیں کہ تحقیقات کرتا پھروں۔ کہ کس نے کیوں جرم کیا۔

"ہاں"۔ پربھا بولی۔ "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قانون اور حکومت دونوں غافل ہیں۔ بیماری ہونے کے بعد علاج کی نامکمل صورتیں تجویز کرتے ہیں۔ بیماری سے لوگوں کو بچانے کا انھیں کوئی طریقہ معلوم نہیں۔"

سریندر نے ذرا سنجیدہ چہرہ بنا کر کہا۔

"پربھا تم کس دنیا میں بستی ہو؟"

"یہ کیوں؟"

"یہ اس لیئے کہ تم عجیب طرح کی باتیں کیا کرتی ہو۔ ایسی باتیں جو اوسط دماغوں میں نہیں سما سکتیں۔"

"آخر میں کیسی باتیں کر رہی ہوں۔"

"دیویوں جیسی۔"

"نہیں تو۔ آدمی کے دماغ میں سبھی باتیں آسکتی ہیں۔ یہ اس سے باہر کی چیز نہیں۔ ہاں آدمی، آدمی بن کر تو سوچے۔"

گھڑی نے آٹھ بجائے۔ ناشتہ ختم ہو چکا تھا دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پربھا گھر کے کاموں میں لگ گئی اور سریندر آفس کے فائل دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد نوکر اس کو لے کر واپس آیا۔ پربھا نے اس کا نام پوچھا۔ نام تھا کیرت

پربھا نے بہت سے سوالات کیئے۔ لیکن وہ صرف اتنا بتا سکا کہ اس کا نہ باپ ہے اور نہ ماں۔ ایک غریب آدمی نے اسے پالا تھا۔ پہلے تو چین سے کٹی لیکن بوڑھے کے مرنے پر تکلیف ہونے لگی۔ تو کام ڈھونڈنے نکلا تھا۔ لیکن خراب صحبت میں پڑ کر چوری کرنے آ گیا تھا۔

✣ ✣ ✣

(۴)

پربھا اور سریندر کی زندگی محبت کا نمونہ تھی وہ دونوں ایک دوسرے پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار تھے۔ سریندر کے باپ بابو دھرندر پرشاد اپنے شہر کے مشہور وکیل تھے۔ پربھا کے باپ مرلی بابو بھی نامی وکیل تھے لیکن لیکن دھرندر بابو کے مقابلے کے نہیں۔ پھر بھی دونوں میں بیحد دوستانہ تھا۔ دونوں کے درمیان کسی قسم کی غیریت نہ تھی دونوں کی دوستی اور محبت کے قصے مثال کے طور پر بیان کیئے جاتے تھے۔

دھرندر بابو کی وکالت جتنی کامیاب تھی اُن کی گھریلو زندگی اتنی ہی ناکام۔ چار بچوں کی موت کے بعد سریندر پیدا ہوا، تو اُن کی دھرم پتنی سدھار گئیں۔ سریندر

کو اس کی پھوپھی نے پالا پوسا۔ بیوی کی موت نے دھرمندر بابو کا دل اُچاٹ کر دیا۔ وکالت میں بھی اُن کی طبیعت نہ لگتی تھی۔ اُن پر ایک قسم کا جنون طاری رہنے لگا۔ وہ دو دو دن کسی سے بات تک نہ کرتے تھے۔ ڈاکٹروں نے انھیں رائے دی کہ کچھ دن سیر و سیاحت میں گزاریں۔ ڈاکٹروں کی رائے پر انھوں نے عمل کیا۔ اور بہت دنوں تک ادھر اُدھر گھومتے پھرتے کشمیر پہنچے۔ کشمیر کی دلچسپیاں انھیں بہت بھائیں اور اُنھوں نے مستقل ارادہ کر لیا کہ وہ ایک عرصے تک وہاں قیام کریں گے۔ (دھرمیندر بابو نے اپنے سارے موکل پربھا کے باپ کے سپرد کیے۔)

دھرمندر بابو جن دنوں کشمیر میں تھے، انھیں مُرلی بابو کا خط یکایک ملا۔ پربھا کے ماں باپ کشمیر آرہے تھے دھرمندر بابو کو بے حد خوشی ہوئی۔ دو سال کے بعد دونوں دوست ملے۔ دونوں کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ لیکن پربھا کی ماں بہت ہی دُبلی ہوگئی تھی۔ دھرمندر بابو نے اُسے پہلی نظر میں پہچانا بھی نہیں۔ پربھا کے باپ نے انھیں بتایا کہ اُن کے کشمیر آنے کی وجہ دراصل بیوی کی صحت کی خرابی ہے کچھ دنوں کشمیر کی سیر کرنے کے بعد مُرلی بابو اپنی بیوی کو چھوڑ کر

گھر واپس آگئے۔

اس واقعہ کو ڈیڑھ سال سے زیادہ بیت گیا
کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ مرلی بابو کام کی زیادتی کی وجہ سے
پھر کشمیر بھی نہ جا سکے۔ برابر ارادہ ہی کرتے رہے۔ آخر مرلی بابو
کو اپنی بیوی کا ایک خط ملا۔ جس میں اس نے لکھا تھا کہ دھرندر
بابو چند دنوں سے لاپتہ ہیں۔ انھیں بہت ڈھونڈا گیا۔ لیکن
کچھ پتہ نہ چلا۔

مرلی بابو پریشان ہو کر وہاں پہنچے۔ ہزار ڈھونڈا
لیکن اس کا پتہ بالکل ہی نہ چلا۔ مجبور ہو کر دونوں واپس آئے۔ اُن
کے ساتھ دھرندر بابو کا وفادار نوکر صغیر بھی تھا، اور اس کی بیوی
بھی۔ جس کے متعلق دھرندر بابو ایک وصیت نامہ چھوڑ گئے
تھے۔ صغیر کی بیوی کی گود میں پانچ مہینے کا ایک بچہ تھا
وصیت نامے میں دھرندر بابو نے لکھا تھا کہ صغیر کو تا زندگی
پچیس روپیے ماہوار پنشن دی جائے۔

مرلی بابو تھک کر واپس آگئے۔ اس حادثے
کا اثر اُن پر بہت زیادہ ہوا۔ پربھا کی ماں کا بھی یہی حال تھا
اُس کی صحت اب پہلے سے بہت اچھی تھی۔ مگر پھر بھی وہ
مضمحل تھی۔ دھرندر بابو کے یکایک غائب ہو جانے سے

لوگوں کو یقین ہوگیا کہ اُنھوں نے سنیاس لے لیا ہے ۔ مرلی بابو نے سریندر کی نگہداشت بڑی محبّت کے ساتھ شروع کی ۔ وہ انھیں کے ساتھ شہر میں رہنے لگا ۔ اِسی دوران میں پربھا پیدا ہوئی ۔ دونوں ساتھ پالے پوسے گئے ۔ کچھ سال کے بعد پربھا کی ماں بھی اس دنیا سے چل بسی ۔ اور مرلی بابو کی محبّت کا مرکز یہ دو بچّے رہ گئے ۔ سریندر نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی یاد تازہ رکھنے کے خیال سے اُنھوں نے پربھا اور سریندر کو بیاہ دیا ۔

سریندر کی ہر ضد مرلی بابو پوری کرتے تھے، اور اُسے بڑی شفقت سے پالا تھا ۔ اس کا اثر سریندر پر بہت زیادہ تھا ۔ وہ اپنے کو کسی حد تک پربھا کا مرہون منت بھی سمجھتا تھا ۔ اسی لیئے وہ پربھا کی ہر ضد، خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو، ضرور پوری کرتا تھا ۔ بلکہ اسے پورا کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا ۔ یہی وجہ تھی کہ سریندر نے خوشی کے ساتھ ایک چور کا اپنے گھر میں رہنا گوارا کرلیا، جو شاید اس کی عدالت میں جاتا تو نہ جانے کتنے دنوں کے لیے جیل خانے کی ہوا کھاتا ۔

(۴)

چند دن اور بھی گزر گئے ۔ کبیر بالکل اچھا ہوگیا ۔ وہ

اتنا بُرا نہ تھا۔ پربھا کو یقین تھا کہ وہ ایک دن اچھا آدمی بن جائے گا وہ زیادہ تر بالکل چپ چاپ بیٹھا رہا کرتا تھا۔ ایک دن وہ بیٹھا تھا کہ پربھا نے اُس سے سوال کیا۔

"تم کیا سوچتے رہتے ہو بھائی ؟"

"سوچتا ہوں کہ اس طرح کب تک نبھے گی۔"

"تو تم کام کرنا چاہتے ہو ؟"

"ہاں ــــــ"

"کون سا کام ؟"

"جو بھی مل جائے۔"

پربھا نے اُس سے پھر پوچھا۔

"تم نے کچھ پڑھا لکھا بھی ہے ؟"

"ہاں ــــــ"

کبیر نے جواب دیا۔ پربھا سوچنے لگی کہ یہ کون سا کام کرسکتا ہے۔ وہ اتنا سمجھ گئی تھی کہ اُسے کوئی اونچی تنخواہ نہیں مل سکتی اُسے یہ بھی گوارا نہ تھا کہ جس کو بھائی کہا، جس کی مرہم پٹی کی اُسے کہیں معمولی خدمت گاری کرنے دے۔ اس نے بہت سوچنے کے بعد ایک راہ نکالی۔ پچاس روپئے اپنے پاس سے دیئے اس کے کپڑے خریدوائے۔ اور کبیر سے کہا کہ اسے پھیری کرکے بیچے۔ جو کچھ

بکری ہو وہ لاکر اس کے ہاتھ میں دیدیا کرے۔

کبیر نے یہ کام خوشی کے ساتھ منظور کرلیا۔ وہ روز صبح سویرے کپڑوں کا گٹھر لے کر چلا جاتا۔ دن بھر اِدھر اُدھر بیچتا اور شام کو واپس آکر جو کچھ بیچتا، پربھا کو دیدیتا۔ پربھا کو خوشی تھی کہ اس کی محنت ضائع نہیں گئی۔ ایک بگڑا ہوا آدمی سُدھر رہا ہے۔ سریندر دل میں اقرار کرتا۔ لیکن پربھا کو چڑانے کو کہدیا کرتا۔

"تم دیکھ لینا پربھا! جب زیادہ رقم ہاتھ لگے گی۔ یہ کہیں کھسک جائے گا۔"

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ برابر اپنی کمائی لاکر پربھا کے ہاتھ میں دیدیا کرتا تھا۔ جو محنت کرتا ہے، فائدہ ضرور ہی اٹھاتا ہے، پچاس روپئے کی رقم چھ سات مہینوں میں بڑھ کر پانچ چھ سو ہوگئی۔ پربھا کو جب کامل یقین ہوگیا کہ کبیر اب کام کر سکتا ہے تو شہر کے ایک بڑے دوکان دار کو بلاکر اس کا معاملہ طے کرادیا۔ اب کبیر کے پاس ایک چھوٹی سی دوکان تھی۔ وہ پھیری کر کے کپڑے نہیں بیچتا تھا ــــــ مگر پربھا کبیر کی دن دونی ترقیوں کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکی۔ سریندر کا کچھ دنوں بعد ہی تبادلہ ہوگیا۔

(۵)

دو تین برس اور بھی گزر گئے۔ اب کبیر اس شہر کا نامی

دکاندار تھا۔ اس کی ایمانداری اور اس کے اخلاق گاہکوں کو اس کی دوکان تک کھینچ لاتے تھے۔ وہ پربھا اور سریندر کو برابر اپنی حالت سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ پربھا خوش ہوتی تھی۔ ایک بار اس نے لکھا کہ وہ بیاہ کرنے جا رہا ہے۔ پربھا اس کے بیاہ میں شریک نہ ہو سکی۔ اُسے بہت افسوس تھا لیکن بہت دور اور مجبور تھی اُس نے تحفے بھیج دیئے۔

دو تین سال اور بھی گزر گئے۔ کبیر نے پربھا کو خوش خبری بھیجی کہ اُسے خدا نے بیٹا دیا ہے۔ پربھا کو اس سے بیحد خوشی ہوئی۔ دوری کے باوجود اُس نے ارادہ کرلیا کہ اس خوشی میں ضرور شریک ہوگی۔ سریندر سے جب اس نے کہا تو پہلے تو اس نے ٹالنا چاہا۔ لیکن پربھا نے کہا۔

"آپ ضرور چلیں، ورنہ کبیر بھائی سمجھیں گے کہ ہم لوگ انھیں بھول ہی گئے۔"

سریندر نے بھی اس بات کو منظور کرلیا۔ اور رخصت کی درخواست دیدی۔ پربھا نے کبیر کو خبر کردی کہ وہ دونوں جلد ہی آنے والے ہیں۔ کبیر کی خوشی کی انتہا نہ رہی اس نے اُن کے آرام و آسایش کے سامان مہیا کرلیے۔

دو چار دن گزرتے کتنی دیر لگتی ہے۔ پانچ چھ سال بعد پھر سب ملے۔ سب خوش تھے۔ کبیر نے اپنی بیوی سے پربھا کو یہ کہتے ہوئے ملایا کہ اِنھیں نے میری زندگی کو سدھار دیا۔ ورنہ آج نہ جانے کیا ہوتا۔

پربھا نے اس بار کبیر کے ساتھ ایک بوڑھی عورت کو بھی دیکھا جس کی آنکھیں بیحد کم زور ہو چکی تھیں۔ کبیر اس کی بہت زیادہ عزت کرتا تھا۔ دریافت کرنے پر کبیر نے بتایا کہ یہی وہ عورت ہے جس نے اُسے پالا ہے۔

پربھا نے جس وقت سے بوڑھی عورت کو دیکھا اس کے دل میں کھلبلی مچ گئی۔ اسے یہ فکر ہو گئی کیسی طرح یہ معلوم کیا جائے کہ کبیر کون ہے۔ اس کے ماں باپ کون ہیں لیکن اسے موقع ہی نہ ملتا تھا مگر اپنے اچھے سلوک سے پربھا نے بوڑھی عورت کو بالکل اپنا لیا تھا۔

آخر پربھا کو ایک وقت مل ہی گیا۔ کبیر کے کچھ سسرالی لوگ آگئے۔ اس کی بیوی عورتوں کی خاطر میں رہی، اور کبیر کچھ کاموں میں پھنس گیا۔ پربھا بوڑھی عورت کو پکڑ کر لے آئی۔ سربندر بھی وہیں بیٹھا تھا۔ اس نے بوڑھی عورت سے پوچھا تو اُس نے بتایا۔

"یہ دراصل میرے مالک کا بیٹا ہے۔ بات یہ ہوئی کہ میرے مالک کی بیوی مر گئیں تو وہ بہت پریشان رہنے لگے۔ ڈاکٹر کے کہنے سے کشمیر چلے گئے۔ میرا شوہر ان کے ساتھ تھا۔ وہ بڑے اچھے آدمی تھے۔ میرے شوہر کو بہت مانتے تھے۔ کچھ دنوں بعد اُن کے ایک دوست کی بیوی بھی بیمار ہو کر وہاں آگئیں۔ وہ اچھی تو ہو گئیں لیکن کبیر ان کے پیٹ میں رہ گیا وہ بہت گھبرائیں۔ بعد بھی ایسی ہی تھی۔ بدنامی کے ڈر سے کوئی ایسی

ویسی بات نہ کی گئی۔ وہاں لوگ یہ جاننے لگے کہ میاں بیوی ہیں لیکن مجھے وہاں بلا لیا گیا۔ اور جب بچہ پیدا ہوا تو میرے حوالے کر دیا گیا۔ اور میں نے اُسے اپنا بیٹا مشہور کر دیا۔ مگر جب اُن لوگوں کے گھر واپس جانے کا وقت قریب آیا تو میرے مالک شرم سے کہیں چلے گئے۔ بہت دن تک اُن کے گھر سے روپیہ آتا رہا۔ مگر پھر بند ہو گیا۔ میرے شوہر بھی مر گئے۔"

پربھا نے جلدی سے پوچھا۔

"اچھا بوڑھی مائی! تمھارے مالک کا نام کیا تھا؟

یہ تو بتایا ہی نہیں۔"

بوڑھی عورت کچھ دیر چپ رہی۔ پھر وہ بولی۔

"بیٹی مگر یہ بات کسی سے نہی نہ کہو تو کہوں۔"

پربھا نے کہا۔"ہاں کبھی کسی سے بھی نہیں کہیں گے۔"

عورت کچھ دیر چپ رہی پھر بولی۔

"میرے مالک کا نام تھا۔ دھرندر بابو وکیل۔"

سریندر نے پربھا کو۔ اور پربھا نے سریندر کو دیکھا۔ اور دونوں دیر تک چپ چاپ ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے۔ کسی کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

خط

جب میں ٹرام میں داخل ہوا تو ڈبہ بالکل بھرا ہوا تھا۔ تھوڑی دور تک مجھے کھڑے ہو کر جانا پڑا۔ پھر بیٹھنے کی جگہ مل سکی۔ کچھ اور دور جا کر ٹرام رکی، تو دو عورتیں اسی ڈبے میں آئیں جس میں میں بیٹھا تھا۔ ایک تو بوڑھی تھی، اُجلے بال اور چہرے پر جھریاں۔ دوسری جوان لڑکی تھی۔ بڑی بڑی اور کالی آنکھیں۔ گورا چہرہ لیکن نہ ماتھے پر لال بندی اور نہ رنگین کپڑے۔ میں نے پہلی نظر میں پہچان لیا کہ وہ بھی بیوہ ہے۔ اس کی گودی میں ایک خوبصورت اور پیارا بچہ تھا۔ ان دونوں کو دیکھتے ہی مجھے خیال آیا کہ اس لڑکی کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ لیکن کب اور کہاں؟ مجھے یاد نہ تھا۔ اس لڑکی نے بھی مجھے ذرا غور سے دیکھا! دونوں الگ کھڑی ہو گئیں۔ میں اپنی جگہ

چھوڑ کر کھڑا ہوگیا، اور اُن دونوں سے بیٹھنے کو کہا۔ وہ لڑکی شرماتی لجاتی ہوئی بیٹھ گئی۔ ایک دوسرے بابو صاحب نے اس بوڑی عورت کو اپنی جگہ دیدی۔

بچہ بڑا پیارا تھا۔ خواہ مخواہ اس کے لئے دل میں محبت پیدا ہوتی تھی۔ وہ برابر میری طرف ٹُھمک ٹُھمک کر ہنستا تھا۔ میں نے بھی ذرا محبت کے ساتھ اُس کو یونہی سا چمکارا وہ بچّہ ماں کی گود سے اُتر کر میری طرف بڑھا لڑکی نے شرما کر بچّے کو گودی سے اتار دیا۔ بوڑھی عورت نے بچّے کو میری گود میں دیدیا۔ میں نے بچّے کو گودی میں اٹھا لیا۔ اس نے آتے ہی ایک جھٹکے کے ساتھ میری عینک اتار لی۔ میں نے عینک ٹوٹنے کے خیال سے لے لی، تو جیب سے قلم نکال لیا اور کھیلتا رہا۔

ایک جگہ ٹرام رُکی، وہ دونوں اُتر گئیں تھوڑی دور جاکر ایک گلی میں گھسیں۔ بچّہ بھی چلا گیا۔ میں پھر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ ٹرام چلی ـــــ میں اپنے گھر بھی پہنچ گیا لیکن وہ بوڑھی عورت، کمسن بیوہ اور ہنس مکھ بچّہ! ساری باتیں میرے دماغ میں چکر لگاتی رہیں۔ بار بار اس بیوہ لڑکی کا کملایا ہوا چہرہ میری آنکھوں میں گھوم جاتا تھا ـــ بار بار خیال

آتا تھا کہ اس کو کہیں دیکھا ہے۔ لیکن کہاں اور کب......؟
یاد نہ آتا تھا۔

* * * * * * * * * * * *

دوسرے دن دس بجے پتا جی کا ایک خط ملا
بلاوا تھا۔ ماں کی طبیعت خراب تھی۔ میں گھر چلا گیا۔ ماتا جی
کا حال اچھا نہ تھا۔ چھ دن سخت پریشانی میں کٹے۔ آفس
کا کام بھی بگڑ رہا تھا۔ آفس سے برابر خط آرہے تھے مگر مجبوری
تھی۔ بارہ دنوں کے بعد ماتا جی کی طبیعت سدھری تو میں نے
کلکتہ واپس جانے کی تیاری کی۔ ماتا جی نے بلا کر کہا۔
"بیٹا اب جلدی شادی کرلے۔ کیا میں تیرا بیاہ
نہ دیکھوں۔ اب تو تیری عمر تیس سال کی ہو رہی ہے اور تیرا
کاروبار بھی چل پڑا ہے ...."
ماتا جی کے آخری جملے نے میرے دل پر تیر
کی چوٹ کا کام کیا۔ ہاں میں نے بھی وعدہ کیا تھا "کاروبار
چل پڑے گا تو بیاہ کروں گا۔" اب تو کاروبار چل پڑا۔ اس سے
پہلے میں بیاہ کرنے کو کسی حال میں بھی تیار نہ تھا۔ رمیش کا انجام
میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس نے یہی غلطی کی تھی
پڑھنا ختم کرتے ہی اس نے اپنی پسند سے بیاہ کرلیا تھا۔ مگر

گی پسند گھر والوں کی پسند سے الگ تھی ۔ شاید میری بھی ہو ۔ تو کیا ہوگا ۔ معلوم نہیں وہ غریب آج کل کہاں ہے ۔ ایک سال سے زیادہ ہوا کہ اُس کا کوئی خط بھی نہیں آیا ۔ اُس نے لکھا تھا —— "اب میں تمھیں خط نہیں لکھوں گا ۔ اس لئے کہ میری مصیبتیں ہر روز بڑھتی جا رہی ہیں ۔ تم انھیں جان کر کڑھو گے اور اسے میں بالکل ہی پسند نہیں کرتا ۔ کہ میری مصیبتوں کے حصّہ دار تم بھی بنو ——"

رمیش کی یاد نے مجھے بہت زیادہ بے چین کر دیا ۔ اس سے ملنے کو بہت زیادہ دل چاہتا تھا ۔ اگر وہ آج میرے پاس ہوتا تو میرا کاروبار دوگنا بڑھ جاتا ۔ آج اکیلا تھا ۔ نہ جانے وہ اپنی بیوی کو لیکر کہاں چلا گیا ۔ ہزار ڈھونڈا اس کا پتہ نہ چلا ۔ معلوم نہیں کس حال میں ہے ۔ میں نے سوچا پھر کسی طرح اس کا پتہ چلانے کی کوشش کروں گا ۔

میں نے اپنی پرانی چیزوں میں سے بہت سی چیزیں اپنے پاس رکھ لیں ۔ انہیں میں رمیش کی ایک تصویر بھی تھی ۔ جب میں سامان درست کر رہا تھا تو میری چھوٹی بہن نے آکر کہا ۔

"بھیا —— آپ کا بیاہ ہوگا ۔ بھابی آئے گی ۔

بڑی اچھی بات ہے۔ ہاہاہا۔"

میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی، وہ برابر شرارتیں کرتی رہتی ہے۔ سوائے ہنسنے اور شرارت کرنے کے اور کوئی دوسرا کام ہی نہیں۔ جب سامنے آتی ہے، دماغ چاٹ جاتی ہے۔ ہے تو چھ سال کی لیکن باتیں بنانا خوب جانتی ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ بہت زیادہ محبت کرتی ہے۔ اسی پر کیا ماتا جی کا بھی یہی حال ہے۔ ہیں تو سوتیلی ماں مگر اپنی ماں سے کم نہیں مانتیں۔ عمر میں تو مجھ سے چھوٹی ضرور ہیں۔ لیکن اتنا زیادہ بڑا پا ہے کہ میری بڑی بہن کو بھی اُن سے آنکھ ملا کر باتیں کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔

میں نے منّی کی باتوں کا جواب نہیں دیا تو بولی،

"بھیّا! تم ابھی سے دولہا بن گئے۔ بولتے کیوں نہیں؟

مجھے اس کی بات پر ہنسی آگئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ کھڑی ہنس رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"بڑی شریر ہے منّی۔ یہ باتیں بنانا کہاں سیکھا تو نے؟"

منّی اپنی بڑی آنکھوں کو مٹکا کر بولی۔
بھابی کے سامنے ایسا مت کہیے گا بھیّا۔ نہیں
تو وہ باتونی اور لڑاکو کہے گی۔ اور ہاں بھابی کو منع کر دیجئے گا
وہ مجھ سے لڑے نہیں ...." وہ کمرے سے چلی گئی۔ لیکن
اس کی ہنسی کی آواز برابر میرے کانوں میں آتی رہی۔ دو ہی
منٹ کے بعد وہ پھر آئی اور بولی۔

"بھیّا — ماتاجی بلا رہی ہیں"

سنتے ہی میں ماتاجی کے پاس چلا گیا۔ انھوں
نے پوچھا۔

"کس وقت جاؤگے یہاں سے بیٹا؟"

میں نے کہا۔

"ایک گھنٹے کے اندر —"

ماتاجی نے پھر پوچھا۔

"بیٹا تو میں لڑکی ڈھونڈوں نا؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور اپنے کمرے
میں چلا آیا — وہاں دیکھا کہ منّی تصویروں کو کھول کر دیکھ
رہی ہے۔ میں نے پوچھا "یہ کیا کر رہی ہے منّی؟"
وہ بولی —

"کچھ نہیں بھیا - یہ دیکھئے آپ کا خط ! تین مہینے ہوئے آیا تھا - ماتا جی نے رکھ دیا - آپ کلکتہ سے باہر گئے تھے، اسی لیے وہاں نہ گیا - پھر وہ بیمار ہوگئیں - دیکھئے دیکھئے — میں نے اس کو حفاظت کے ساتھ رکھ دیا تھا"

منّی نے لفافہ میری طرف بڑھایا - میں نے پہلی نظر میں پہچان لیا - حرف رمیش کے تھے - میرا کلیجہ دھک سے ہوگیا میں نے بے چینی کے ساتھ لفافہ کھول کر پڑھنا شروع کیا خط بالکل مختصر سا تھا -

دھرنیدر ——

میں سینکڑوں نہیں، لاکھوں آفتیں جھیل کر پھر کلکتہ آگیا ہوں - بیمار ہوں، خون تھوک رہا ہوں یقین ہے خط پاتے ہی تم مجھ سے ملنے آؤگے - لیکن اس کا یقین نہیں کہ جب تم آؤگے تو میں زندہ بھی رہوں گا یا نہیں -

میں ۱۱ کالی چرن لین میں ٹھہرا ہوں —

ضرور ملو........

رمیش

خط پڑھ کر میرا سر چکرا گیا، رنج و غم کے ملے ہوئے

آنسو میری آنکھوں میں تیرنے لگے۔ منّی نے دیکھا تو ماتاجی سے کہہ آئی۔ وہ کمزور تھیں لیکن میرے کمرے میں آگئیں اور وجہ پوچھی۔ میں نے خط ان کے ہاتھ میں دیدیا۔ خط انھوں نے پڑھا اور بولیں۔

"آہ کتنا شریف آدمی تھا۔ بیٹا تم جاکر فوراً اس کا پتہ چلاؤ۔"

میں اُسی وقت ماتاجی، پھر پتاجی کے چرن چھوکر کلکتہ روانہ ہوگیا۔

* * * * * * * * * * * *

ہوڑہ میں دس بجے رات کو پہنچا۔ اُسی وقت کالیچرن لین کا پتہ چلنا مشکل تھا۔ میں اپنے مکان پر چلا آیا رات بھر رمیش کی صورت شکل اس کی ہنسی اور اس کی ساری باتیں یاد آتی رہیں۔ خاص کر اُس کے بیاہ کی باتیں مجھے اس کے بیاہ میں شریک نہ ہونے کا سخت افسوس تھا میں اُن دنوں ملیریا میں گرفتار ہوگیا تھا۔ میں رمیش کے خیال میں رات بھر نہ سو سکا۔ بار بار دل دُکھ اُٹھتا، نہ جانے وہ کس حال میں ہے۔ انھیں الجھنوں میں مجھے نیند آئی۔

میری اور رمیش کی ملاقات اُس دن ہوئی تھی

جب ہم دونوں ایک ہی کالج میں داخلہ کے لیئے گئے تھے۔ اُس نے مجھ سے یاد نہیں کیا پوچھا تھا اور میں نے جواب دیا تھا "مجھے معلوم نہیں"۔ پھر باتیں ہوئیں۔ داخلے کے بعد ہم دونوں ساتھ ساتھ رہنے لگے۔ ہم دونوں ہوسٹل ہی میں رہتے تھے اُسے دوسو روپئے ماہوار ملتے تھے۔ اس کا باپ بہت بڑا زمیندار تھا۔ اور میں تھا معمولی آدمی۔ پتاجی ایک دفتر میں کلرک تھے۔ سو روپئے ماہوار انھیں ملتے تھے۔ یعنی رمیش کو جو رقم خرچ کرنے کو ملتی تھی اس سے آدھی۔ مجھے پچیس تیس روپئے آتے تھے۔ اور کبھی کبھی بیس ہی۔ بڑی بہن کے بیاہ کے لیئے پتاجی کو قرض لینا پڑا تھا، اور اس کی ادائیگی کی فکر میں سخت پریشان تھے۔

رمیش کو جب میری حالت معلوم ہوئی تو اس نے مجھے رائے دی کہ گھر سے کوئی رقم نہ منگایا کروں۔ لیکن نہ تو مجھے یہ پسند تھا اور نہ پتاجی منظور کرتے۔ ہم دونوں خرچ کم کرنے کے خیال سے ہوسٹل چھوڑ کر شہر میں آگئے۔ ایک کمرہ کرایے پر لے کر رہنے لگے۔ میرے جتنے روپئے آتے تھے، رمیش اُسے لے لیا کرتا تھا۔ ہم لوگ بڑے آرام کی زندگی گزارتے تھے۔ کالج کے دوسرے ساتھی ہمیں دیکھ کر

رشک کرتے تھے۔

ہم دونوں میں گہری محبت تھی۔ بہت سی باتوں میں ہم دونوں کا خیال ایک تھا۔ البتہ ہم دونوں میں کبھی اختلاف ہوتا تھا، تو مذہب کے بارے میں۔ وہ کٹر لا مذہب ہوگیا تھا لیکن میں مذہب کو کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کے لیئے تیار نہ تھا۔ وہ ہر لحاظ سے ایسا آدمی تھا جس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ ہم دونوں برابر ساتھ رہا کرتے تھے۔ انتہا تو یہ تھی کہ چھٹیوں میں بھی ساتھ ہی رہتے۔ کبھی چھٹیاں میرے گھر پر گزرتیں، کبھی اس کے گھر پر۔ اس طرح زندگی کے چار سال بڑی خوشی کے ساتھ کٹے۔

ہم لوگ بی۔ اے کے ٹسٹ کا امتحان دیکر فائنل کی تیاری کر رہے تھے۔ اسی زمانے میں ایک دن ایک لڑکا ہم لوگوں کے پاس آیا۔ اُس نے کہا کہ وہ ٹسٹ کا امتحان دے چکا ہے۔ لیکن یونیورسٹی فیس کا کوئی سامان نہیں۔ اور وہ ہماری مدد چاہتا ہے۔ رمیش نے پوری فیس ادا کردی۔ اس کے بعد وہ اکثر آیا کرتا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد ڈاکٹروں نے دق تجویز کی اور آنا جانا بند کردیا۔ وہ غریب امتحان بھی نہ دے سکا۔ رمیش اکثر اس کو دیکھنے جایا

کرتا تھا، لیکن مجھے اس سے کوئی خاص دل چسپی نہ تھی میں کبھی اُسے دیکھنے نہ گیا۔

جس سال میں نے بی۔ اے کا امتحان دیا۔
اسی سال پتاجی نوکری چھوڑ کر گھر چلے آئے۔ میں امتحان کے بعد گھر آنے لگا تو رمیش نے ایک پاس بک میرے حوالے کی اس میں وہ تمام روپئے جمع تھے، جو وہ مجھ سے لیتا گیا تھا۔ کچھ ہاں نہیں کے بعد میں نے پاس بک لے لی۔ اور گھر چلا آیا۔ رمیش نہ میرے گھر آیا اور نہ اپنے گھر گیا۔ برابر کلکتہ ہی میں رہا۔
کچھ دنوں کے بعد رمیش کا خط ملا۔ جس سے
معلوم ہوا کہ وہ لڑکا مرگیا۔ اب صرف اس کی ایک بوڑھی ماں ہے اور ایک کنواری بہن۔ اور رمیش اب انھیں کے ساتھ رہتا ہے۔ پھر اس کا ایک خط ملا۔ جس میں اُس نے لکھا تھا کہ اُسے دونوں ماں بیٹیوں سے بے حد ہمدردی ہے۔ اس لیئے اس لڑکی سے بیاہ کررہا ہے۔ اُس نے مجھے بلایا تھا۔ میں نے جواب میں شرکت کا وعدہ کرلیا۔ اُسے سمجھانے کا کوئی فائدہ ہی نہ تھا میں جانتا تھا کہ وہ بہت سوچ بچار کے بعد کسی فیصلے پر پہنچتا ہے۔ اس کے بعد اس کا فیصلہ اٹل ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بیاہ سے کچھ دنوں پہلے میں بیمار ہوگیا۔ اور میں نے معافی کا

خط لکھ کر اُسے بھیج دیا۔

میں بہت دنوں تک بیمار رہا۔ اس بیچ میں وہ ایک بار مجھ سے ملنے آیا۔ اُس نے بتایا کہ وہ بیاہ کر چکا۔ اور باپ نے خفا ہو کر اس کا خرچ بند کر دیا ہے۔ گھر میں قدم رکھنے کی بھی اجازت نہیں۔ ساتھ ہی اُس نے یہ بھی بتایا کہ اُس کا ارادہ بمبئی چلے جانے کا ہے۔ کچھ دن میرے ساتھ رہ کر وہ چلا گیا۔

میں بیمار ہی تھا کہ اس کا ایک خط الہ آباد سے آیا۔ اُس نے لکھا تھا کہ ایک اسکول میں اُسے ملازمت مل گئی ہے۔ معمولی طور سے زندگی گزارنے کا سہارا اُسے مل گیا ہے۔ مجھے بڑا افسوس ہوا۔

جب میں تندرست ہو گیا تو پتا جی نے مجھے کچھ روپئے دیے اور میں نے اپنا کاروبار شروع کیا۔

* * * * * * * * * * * * *

صبح ہوئی تو ناشتہ کر کے رمیش کو ڈھونڈنے نکلا۔ بڑی مشکل سے کالی چرن لین کا پتہ چلا پھر نمبر ۱۱ میں گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ دو مہینے سے زیادہ ہوا، وہ لوگ گھر چھوڑ گئے۔ میں ایک نئی اُلجھن

میں پھنس گیا۔ سخت کوششوں پر بھی یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ لوگ کہاں گئے۔ البتہ ایک آدمی نے دل کو سخت چوٹ پہنچانے والی خبر سنائی اور وہ یہ کہ رمیش مرگیا۔

اُس دن میں خوب رویا۔ شاید زندگی میں اتنا زیادہ کبھی نہ رویا تھا۔ اپنی ماں کے مرنے پر بھی نہیں۔ آفس بھی نہ گیا۔ روتا روتا سو رہا۔ رات بھر جاگتا رہا تھا، شام کو آنکھ کھلی۔

تین چار دن اور گزر گئے۔ رمیش کا خیال میرے دل سے نہ جاتا تھا۔ بار بار جی کھل کر رونے کو چاہتا تھا۔ ہر وقت اُس کی بیوی کا خیال رہا کرتا تھا، جس کے لیئے اُس نے ہر طرح کی مصیبتیں اٹھائیں اور جان دی۔

ایک شام کو میں ٹرام پر واپس آ رہا تھا ٹرام ایک جگہ رُکی اور وہی بوڑھی عورت سوار ہوئی۔ اُس نے مجھے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ اور بولی۔

"بابو صاحب! اُس دن بچہ آپ کا قلم لے کر چلا گیا۔ میں دو تین دن تک آپ کی تلاش میں آئی لیکن ملاقات نہ ہوئی۔ چلیئے اپنا قلم تو لے لیجیئے۔"

اتنا کہہ کر وہ ٹرام سے اُتر گئی۔ اور مجھے بلایا۔ میں بھی اُتر گیا۔ سب سے پہلے میں نے بچّے کی خیریت پوچھی۔ اُس نے بتایا کہ وہ تو بالکل اچھا ہے لیکن اُس کی ماں کی حالت اچھی نہیں۔ اُس کو بُرے قسم کی دق ہوگئی ہے۔ میں نے جلدی سے بڑھ کر بچّے کے لیئے ایک دوکان سے مٹھائی خریدی اور ساتھ ہولیا خالی ہاتھ کیسے جاتا۔ راستے میں پھر میں نے دریافت کیا کہ بچّے کا باپ کہاں ہے؟ بوڑھی عورت نے جواب دیا۔

"دو مہینے ہوئے۔ وہ آٹھ مہینے بیمار رہ کر مرگئے۔ اُنھیں دق تھی۔"

یہ سنتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا۔ اور میں نے پوچھا۔

"آپ لوگ پہلے کالی چرن لین میں تو نہیں تھیں؟"

اُس نے جواب دیا۔

"رمیش بابو وہیں مرے۔"

میں تیزی کے ساتھ چلنے لگا۔ بوڑھی

عورت ایک دروازے کے اندر گھسی فلم لے آئی۔ میں نے بچے کو مانگا ۔ وہ لے آئی ۔ میں نے بچے کو گودی میں لے لیا ۔

بچے کو گودی میں لیتے ہی جیسے میرا دل اُبل پڑا ۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی طرح دل کو قرار آئے گا ہی نہیں ۔ بوڑھی عورت نے گھبرا کر پوچھا ۔

"آپ رو کیوں رہے ہیں ؟"

میں نے مشکل سے کہا ۔

"رمیش بابو نے آپ لوگوں کے سامنے دھرندر کا کبھی نام لیا تھا ؟......"

بوڑھی عورت نے مجھے غور سے دیکھا پھر جواب دیا ۔

"وہ تو آخر وقت تک اُن کا نام لیتے رہے ۔ کہتے تھے کہ اگر دھرندر مل جاتا تو مجھے اطمینان ہو جاتا ۔ پر وہ ملے ہی نہیں ۔ ہزار ڈھونڈا اُن کا پتہ نہ چلا ۔"

رمیش بابو نے اُن کے نام ایک خط

لکھ کر مجھے دیا تھا۔ وہ اب تک پڑا ہے۔ دوسرے ہی دن وہ مر گئے۔

میری آنکھوں سے آنسو ضبط کی کوشش کے باوجود............ بہتے جا رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ اُداس لڑکی دروازے پر کواڑ کی آڑ سے مجھے جھانک رہی ہے۔ آہ اُس کا مُردنی چہرہ!——

بوڑھی عورت نے پھر پوچھا۔

"آپ روتے کیوں ہیں؟"

میں نے بڑی مشکل کے ساتھ جواب دیا۔

"میں ہی دھرندر ہوں——"

وہ دونوں ماں بیٹیاں مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگیں۔ رنج اور خوشی کے ملے ہوئے آنسو اُن کی آنکھوں سے بہہ نکلے—— بوڑھی عورت مجھے گھر میں لے گئی—— دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ اب میں نے اُس اُداس لڑکی کو پہچان لیا۔ رمیش نے اس کی تصویر مجھے بھیجی تھی—— بوڑھی عورت نے وہ خط لاکر مجھے دیدیا۔ لکھا تھا۔

پیارے دھرندر ——

اب یقین ہو چکا ہے کہ تمہیں نہ دیکھ سکونگا اگر یہ خط تمہیں مل جائے تو ملنے کی کوشش کرو۔ مگر یقین نہیں کہ یہ خط تم تک پہنچ سکے گا۔ خیر۔ مختصر یہ ہے کہ میرے بعد ان تینوں معصوم زندگیوں کا تمھارے سوا اس دنیا میں کوئی سہارا نہیں۔ اگر میری محبت تمھارے دل میں باقی ہے۔ تو صرف ایک فرمایش کروں گا۔ اور وہ یہ کہ ان تینوں کو تم اپنے سے الگ نہ کرنا۔ ایک بات اور جس کا مجھے یقین ہے کہ تم کبھی پسند نہ کروگے۔ مگر میرا کام ہے کہہ دینا۔ وہ یہ کہ تم نے اگر شادی اب تک نہ کی ہو تو اپنی بھاوج کو راضی کر کے اس سے بیاہ کر لو۔ لیکن جانتا ہوں کہ تم کٹر ہندو ہو ایسا کبھی نہ کروگے ——

تمہارا.........

رمیش

خط میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی۔ میں اُن تینوں کو اس چھوٹے سے مکان سے اپنے مکان میں لے آیا۔ علاج باضابطہ کیا۔ لیکن کملا کی زندگی پوری ہو چکی تھی۔ رشی کا خط اب بھی میرے پاس حفاظت کے ساتھ رکھا ہوا ہے۔

جہیز

۱
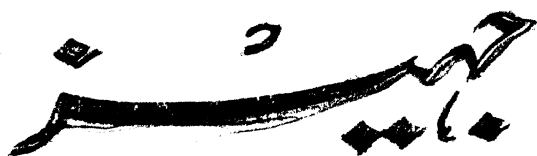
پنڈت رادھے شیام جی اونچی ذات کے برہمن تھے ۔ بے حد شریف اور نیک طینت اُن کی ذاتی اور نسبی شرافت گاؤں کے اطراف و جوار میں ضرب المثل تھی۔ ہر شخص ان کو عزت کی نظر سے دیکھتا تھا ۔ مگر پنڈت صاحب دولت مند نہ تھے ۔ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے دوسرے پنڈتوں کی طرح اوروں کی جیب سے پیسے نکال لینا بھی نہ جانتے تھے ۔ دو بگیہہ کھیت اور مندر کی مختصر آمدنی پر قناعت کرکے اُسی چھوٹے سے گاؤں میں اپنی زندگی کے چالیس سال عزت و آبرو سے گزار چکے تھے ۔ توکل کا مادہ اتنا تھا کہ باوجود سخت تکلیفوں کے بھی کبھی گاؤں سے باہر قدم نہ نکالا ۔ جب ان کی بیوی "پریمل" تکلیفوں سے اُکتا کر کہتی ۔ "شہر جاکر کوئی نوکری کیوں نہیں کرتے؟" تو وہ نہایت خندہ پیشانی سے کہتے ۔" برہمن نوکری کرنے کو

نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ بلکہ صرف ایشور کی پوجا کرنے اور دوسروں کو دھرم کے کام بتانے کو۔

پرچھل خاموش ہو جاتی۔

اُن کا نوکر بھجنا کہار، جس کو انھوں نے بچپن سے اپنے بچے کی طرح پالا تھا۔ گھر باہر کا کام کیا کرتا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اُس دو بیگھہ زمین سے بھی کچھ اُسی کی وجہ سے مل جاتا تھا ورنہ پنڈت جی کو مندر سے کب فرصت ملتی تھی کہ وہ کھیتی کا کام دیکھتے۔

"تارا" اُن کی اکلوتی بیٹی تھی، ایک تو تو دبے حد شریف خصلت تھی دوسرے باپ کی تعلیم اور ماں کی تربیت نے اُس کی خوبیوں میں اور بھی چار چاند لگا دیے تھے۔ ہندی اور سنسکرت کی اچھی تعلیم کے علاوہ وہ گرہستی کے تمام امور سے واقف تھی۔ اس قلیل آمدنی میں خانہ داری کا سارا انتظام کرنا کچھ تارا ہی کا کام تھا۔ اب اُس کی عمر چودہ سال ہو چکی تھی، مگر نہ تو بیاہ ہوا تھا اور نہ کوئی سامان ہی تھا۔

ایک دن باتوں باتوں میں پڑوس کی ایک عورت نے پنڈت جی کی بیوی سے کہدیا۔ "تارا اب تک

کنواری ہے اکثر لوگوں کو اس امر کے متعلق چہ می گوئیاں کرتے ہوئے میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے پنڈت تا فی جی یوں تو سب کچھ پرمیشر ہی کرتا ہے، مگر تارا کے بیاہ کے متعلق میں نے آپ لوگوں کی بھی کوئی سرگرمی نہ دیکھی۔"

پنڈت جی کی بیوی بولیں "بہن کوئی اچھا بر نہیں ملتا۔ اسی وجہ سے دیر ہو رہی ہے۔ نہیں تو کوئی خوشی سے جوان بیٹی کو گھر میں بٹھائے رکھتا ہے۔" مگر اُن کے دل میں ایک چوٹ سی لگی، اور وہ اداس سی ہو گئی۔

ہمسائی بولی "دیوی جی میں نے اس لیے کہا ہے کہ دوسروں سے تذکرہ سن کر بُرا معلوم ہوا نہیں تو میں نہ کہتی۔ کہیں آپ مجھ سے خفا نہ ہو جائیے گا۔ برہمنوں کا ناراض ہونا کسی کے لیے اچھا نہیں ہے۔"

پرپھل نے کہا "نہیں بہن میں ایسی پگلی نہیں ہوں کہ تو میری ہمدردی کرے اور میں تجھ سے ناراض ہو جاؤں"

ہمسائی کے چلے جانے کے بعد پرپھل پلنگ پر پڑ رہی اور رونے لگی۔

پنڈت جی بیساکھ کی چلچلاتی دھوپ میں ٹھیک دوپہر کے وقت کہیں سے گھر آئے۔ پیاس معلوم ہو رہی تھی

آتے ہی پانی مانگا۔ تارا نے تازہ پانی کنویں سے کھینچ کر لوٹے میں لاکر سامنے رکھ دیا۔ پنڈت جی نے اٹھا کر پینا ہی چاہتے تھے کہ پرپھل بولی "مہاراج کچھ کھا کر پی جیئے"۔

پنڈت جی نے لوٹا رکھ دیا۔ پرپھل نے دو چار لڈو سامنے لاکر رکھدیئے۔

پنڈت جی نے کھا کر پانی پیا پھر بولے "کل کے مندر سے آئے ہوئے لڈو اب تک اسی حالت میں پڑے رہے" پرپھل نے کوئی جواب نہ دیا۔

یہ بالکل نئی بات تھی، پنڈت جی دریافت کریں اور جواب ندارد۔ پنڈت جی نے پوچھا۔

"آج تم اُداس کیوں ہو؟"

پرپھل بولی "مہاراج ایک سوچ میں ہوں ذرا آرام کر لیجیئے تو کہوں"۔

پنڈت جی نے کہا "کہو کیا بات ہے؟"

پرپھل بولی "بات یہ ہے کہ ابھی روپن کی ماں کہنے لگی "کہ اکثر لوگ تارا کے اب تک بیاہ نہ ہونے پر چہ می گوئیاں کرتے ہیں۔ اور ہماری ہنسی اڑاتے ہیں"۔

پنڈت جی نے کہا "ایشور کی یہی مرضی ہے

تو ہم کچھ نہیں کر سکتے۔"

پرِیمل خاموش ہوگئی، تھوڑی دیر کے بعد بولی

"تو آخر جوان کنیا کو کب تک گھر میں بٹھائیے گا۔"

پنڈت جی نے کہا "مجھے خود بھی فکر ہے اور سخت فکر، دیکھو ابھی پنڈت جی گوری شنکر کے یہاں سے آرہا ہوں، بتاؤ کوشش تو کر رہا ہوں، مگر اس کی قسمت کو کیسے بنا دوں پنڈت جی کو میں نے کوئی اچھا بَر ڈھونڈنے کو کہا تھا آج دو ہفتے کے بعد جب میں نے دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ پنڈت اودھ کشور جی کو ایک کنیا کی ضرورت ہے جب میں نے پوچھا کہ کیا بیٹے کے لیئے تو بولے نہیں بھائی خود اپنے لیئے۔ میں خاموش ہوگیا۔ وہ پھر میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بڑی محبت سے بولے رادھے شیام اُن کی عمر تو ضرور کچھ زیادہ ہے۔ مگر گھر اچھا ہے۔ لڑکی رانی بن کر رہے گی تلک اور جہیز کے جھگڑوں سے بھی بچو گے۔ اگر تم کہو تو میں ان ہی سے تمہیں کچھ اور روپیئے دلا دوں۔ میں کیا جواب دیتا مجھے غصہ آگیا۔ میں اُٹھ کر چلا آیا۔ اب تمہیں بتاؤ کیا کروں؟"

پرِیمل نے کہا "تو اور کوئی بَر نظر میں نہیں ہے"

پنڈت جی بولے "لڑکے تو دو اور ہیں مگر وہ

میری حیثیت سے بہت زیادہ تلک اور جہیز مانگتے ہیں ۔ اب ایشور کی جو اِچھا ہوگی ۔ وہی ہوگا ۔ ہمارے تمہارے کیئے تو کچھ نہیں ہوتا ۔"

پنڈت جی نے ایک سال تک کوئی اچھا بر ڈھونڈنے کی جان توڑ کوشش کی ۔ مگر آج کل اچھے لڑکے کہاں ملتے ہیں ۔ پنڈت جی دولت نہ چاہتے تھے ۔ مگر لڑکا نیک اور ہونہار چاہتے تھے ۔ ایک لڑکا اُن کو بہت پسند تھا ۔ بی اے تھا ۔ گھر بھی اچھا تھا ۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اس کے والدین تلک اور جہیز ملا کر چار ہزار روپیوں سے کم پر راضی نہ ہوتے تھے اور اتنی بڑی رقم اُن سے بن نہ آتی تھی ، وہ ایک رشتہ دار کے یہاں اس لیئے گئے کہ سفارش کرا کے رقم کچھ کم کرائیں ۔ مگر امید کے خلاف اُس نے جواب دیا " لڑکی کیا اتنی امید پر پیدا کی تھی ، آہ سماج کس قدر سنگدل اور کٹھور ہے کسی کی مجبوریوں کا خیال بھی نہیں کیا جاتا ، اور نہ خوبیاں دیکھی جاتی ہیں ۔ سب کی نظریں سنہری روپہلی سکّوں پر پڑتی ہیں ۔ انھوں نے سارا حال بیوی سے کہہ دیا ۔ وہ غریب رونے لگی ۔

تارا اپنی وجہ سے والدین کی پریشانیوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی تھی ، زندگی اُس پر بار ہوگئی

وہ اکثر سوچا کرتی تھی کہ کس طرح اس الجھن سے والدین کو نجات دلائے۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ ایک مرتبہ مجبور ہوکر اس نے دل ہی دل میں کہا "تکالیف کا مقابلہ کرنا ہی انسانی زندگی کی معراج ہے"

اس کا عزم کمزور ہوگیا، ہمت بڑھ گئی اور وہ اپنے ارادے سے باز آگئی۔

تارا کا سولھواں سال تھا مگر کوئی اچھا بر نہ ملا۔ ایک دن پرپھل نے کہا "مہاراج آج کونسا آرام ہے کہ کل کی تکالیف سے ڈریں۔ آخر یہ دو بیگھہ زمین کس دن کام آئے گی"

پنڈت جی نے کہا "مگر مشکل تو یہ ہے کہ اس کی کل قیمت صرف تلک اور جہیز کو بھی ناکافی ہوگی۔ اور دوسرے اخراجات تو اس کے علاوہ ہیں"

اس گفتگو کے تیسرے دن پنڈت جی نے کہا "تارا کی ماں! ایک صورت سمجھ میں آئی ہے۔ اگر میں کامیاب ہوگیا تو خیر نہیں تو انجام ایشور ہی بہتر جانتا ہے"

پرپھل سنکر متحیّر ہوگئی۔ اس نے دریافت کیا مگر پنڈت جی بولے "پھر معلوم ہوجائے گا"

اُسی دن سے زمین بیچنے کی گفتگو ہونے لگی
بہت جلد ہی اُنھیں کے ایک رشتہ دار نے آٹھ سو میں خرید
لیا۔ وہ روپے لے کر گھر بہت خوش خوش آئے اور بیوی سے
بولے "سنو اب تارا کا بیاہ اس دھوم دھام سے کروں گا
کہ لوگ دیکھیں گے اور واہ واہ کریں گے لو یہ دو سَو روپے اور
ضروری چیزیں بناؤ۔ میں کل ہی شہر جاؤں گا" پر پھل اس ارادہ
کو سنکر جس سے پنڈت جی کو قریب قریب نفرت تھی
حیرت زدہ ہوگئی۔
پنڈت جی دوسرے دن صبح سویرے اُٹھے
ضروریات سے فارغ ہوکر غسل کیا۔ ناشتہ کیا اور کچھ کھانا
ناشتہ کے لیئے لے کر گھر سے نکل پڑے۔ بھجنا دور تک پہنچانے
آیا، مندر کے قریب پہنچے تو اُن کا دل بھر آیا۔ ایک بار پھر
وہ مندر میں گئے اور دیوی کی مورتی کو ڈنڈوت کر کے بولے
" دیوی میں خوشی سے نہیں تجھے چھوڑ رہا ہوں، میری مجبوریوں
سے تو واقف ہے۔ خیر تیرے پجاریوں کی کوئی کمی نہیں ایک
میں نہ رہا تو کیا ہے" مندر سے نکلے تو بھجنا انتظار میں کھڑا تھا دونوں
ساتھ ہو لیئے اور باتیں کرتے دور نکل گئے دور جا کر پنڈت جی
کو خیال آیا تو بھجنا سے کہا "جا بیٹا! گھر جا ہاں ایک نئی دھوتی

بنوالینا میں نے کہہ دیا ہے اور دیکھ بیٹا چین سے رہنا۔

بھجنا نے چرن لیے اور بولا "مہاراج، جب تک جیتا ہوں کھتا نہ ہوگی۔ ہوں تو نیچ جاتی کا بیٹا، مگر پالا گیا ہوں برہمن کے گھر میں۔"

پنڈت جی نے اشیرباد دی، گھر کی طرف حسرت آمیز نگاہوں سے دیکھا اور روانہ ہوگئے۔

شہر پہنچکر بہت جلد ہی پانسو کی نقد ضمانت پر ایک ہوٹل میں تیس روپیہ ماہوار کی مینجر کی جگہ مل گئی۔ ان کے حسن سلوک سے مالک اور نوکر دونوں خوش تھے۔ اُن کی شرافت اور نیک نفسی کا ہر شخص مداح تھا۔ ہر شخص دل سے اُن کی عزت کرتا تھا اور مالک تو پرستش کرنے لگا تھا۔

گھر سے برابر خط وکتابت ہوتی رہی، وہ برابر روپے بھیجتے رہے۔ تین مہینے بعد گھر سے ایک خط آیا جس نے اُن کے اس عارضی سکون کو تباہ کردیا۔ خط پڑھ کر پنڈت جی کو پھر ایک بار اپنی بیچارگی کا احساس ہوا۔ لڑکے والوں کا تقاضا تھا کہ جلد از جلد اسی گرمیوں کی چھٹیوں میں بیاہ ہوجائے لڑکا ساٹھ روپیہ ماہوار پر ایک اسکول میں ملازم ہوچکا تھا۔ اگر اس سال شادی نہ ہوتی تو پھر دوسرے سال کا انتظار کرنا پڑتا

پنڈت جی کے ہاتھ میں خط تھا اور دماغ ایک نہ سلجھنے والی گتھی کو سلجھانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔ کسی فوری خیال نے ان کے چہرے پر مسرت کی ایک ہلکی سی لہر دوڑا دی جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی ہو۔

دن مقرر ہو گیا۔ مقررہ تاریخ سے پندرہ دن پہلے پنڈت جی رخصت لیکر گھر چلے گئے اور گھر پہنچکر بڑے اہتمام کے ساتھ بیاہ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ لوگوں کو حیرت تھی کہ یک بیک اتنا روپیہ کہاں سے آگیا۔ اکثر لوگ پنڈت جی سے پوچھ بھی بیٹھے۔ مگر پنڈت جی نے جواب میں کہا "بھائی لکشمی کی دین ہے"

تمام تیاری امیرانہ شان سے ہوئی۔ ہاں صرف مکان امیرانہ نہ تھا۔ برات کا دن بھی آگیا۔ گھر میں پہل پہل اور باہر پنڈت جی کاموں سے پریشان تھے۔ گھر میں گاؤں کی اور دوسری مہمان عورتوں کا ہجوم تھا، اور باہر مردوں کا، کوئی کسی کام میں مصروف تھی تو کوئی کسی کام میں، کچھ عورتیں ایک جگہ بیٹھکر گیت گا رہی تھیں۔ جوان لڑکیاں کمرے میں تارا کو گھیرے بیٹھی تھیں، بچے آنگن میں کھیل رہے تھے۔ کچھ باہر گاؤں سے دور برات کے استقبال کو چلے گئے۔

برات دھوم دھام سے آرہی تھی، دور ہی سے باجے کی آواز سنائی دیتی تھی، لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ ناچ گانا ہوگا۔ اکثر لوگ دوسرے گاؤں سے آکر پہلے ہی سے برات کے منتظر تھے۔ بھنا جس نے

کبھی پھٹے ہوئے گاڑھے کی دھوتی کے سوا کوئی کپڑا نہ پہنا تھا آج بڑھیا ململ کی دھوتی اور ڈھاکہ کی ململ کا کرتہ پہنے اُڑتا پھرتا تھا۔

برات آئی، بیاہ ہوگیا، لوگوں نے خوب کھایا، ہر چیز کی تعریف ہوئی۔ رات بھر ناچ گانا رہا۔ تمام لوگ تماشے کے پیچھے رات بھر پاگل بنے رہے۔ دوسرے دن تارا رخصت ہوکر سسرال چلی گئی۔ پنڈت جی نے اطمینان کا سانس لیا۔ روتی ہوئی پربھل کے پاس آکر بولے "لو اب خوش ہو ایک بڑے بوجھ سے ایشور نے چھٹکارا دلایا۔" مگر پربھل روتی ہی رہی۔

تارا سسرال سے رخصت ہوکر آئی۔ دو چار دنوں کے بعد پنڈت جی شہر کو روانہ ہوگئے حالانکہ لوگ روکتے رہے۔ جس وقت گھر سے چلنے لگے، اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو چار قطرے زمین پر گرے اور غیر ارادی طور سے زبان سے نکل گیا "اب ایشور ہی جانے کتنے دنوں بعد گھر آنا نصیب ہوتا ہے۔"

شہر پہنچکر اپنی جگہ پر آ گئے پانچ چھ دن کے بعد مالک نے حساب مانگا۔ تحویل سے چھ ہزار روپیہ نقد غائب تھا۔ جب مالک نے دریافت کیا تو پنڈت جی نے سارا حال صاف صاف کہہ دیا تھانے سے پولیس آئی اور ان کو گرفتار کرکے لے گئی۔ مالک کو ان کی اس حرکت پر بڑا غصہ آیا وہ کہتا تھا "یہ تو بڑے بگلا بھگت نکلے"

اُس نے مقدمہ چلا دیا۔

پنڈت جی کی طرف سے پیروی کے لیے اُن کے سمدھی آئے ہوئے تھے۔ پنڈت جی نے برسرِ اجلاس اپنے جرم کا اعتراف کرلیا۔ اُن کے سمدھی وہاں پر موجود تھے، اُنھوں نے حاکم کو مخاطب کرکے کہا۔

"جناب اب مجھے سزا دیجیے یا رہا کیجیے، اس مقدمہ کا انجام خواہ کچھ ہو مجھے اب فکر نہیں مگر میرا یہ فعل قصداً اور خوشی سے نہ تھا بلکہ سماجی مجبوریوں کی وجہ سے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو شاید میری بیٹی کا بیاہ ہونا بھی ناممکن تھا۔ اب مجھے کوئی بُرا کہہ کے کیا کریگا۔ لیکن یہ بھی کہہ دیتا ہوں کہ اُس رقم کو واجب الادا قرض سمجھتا ہوں، زندگی نے ساتھ دیا تو میں کل روپیئے ادا کردونگا۔ خواہ مجھے سزا ہو یا نہ ہو۔"

خدا معلوم ان الفاظ نے مالک پر کیا اثر کیا کہ اس نے مقدمہ واپس لے لیا۔ پنڈت جی اب بھی اسی ہوٹل میں اپنی جگہ پر کام کر رہے ہیں۔ مالک نے روپے بھی نہ لیے، مگر اکثر خود ہی کہا کرتے ہیں "دنیا میں میں نے دیدہ و دانستہ صرف ایک گناہ کیا ہے۔ مگر بہت بڑا۔ اتنا بڑا کہ جس کا کفارہ ناممکن ہے"۔

وہ دونوں

"حضرت! آپ آخر مجھ سے یہ کیوں پوچھتے ہیں کہ میں کس حال میں ہوں۔ آپ کو میری زندگی سے کیا دلچسپی ہے۔ میں اپنی زندگی بالکل الگ گزار رہا ہوں آپ نے آخر یہ سوال ہی کیوں کیا؟ میں نے آپ سے کبھی یہ پوچھا ہے کہ آپ نے کتنے مرغ ہضم کیے۔ کتنے سیر گھی اور کتنا آٹا آپ کے معدے میں جذب ہوگیا۔ آپ کا پوچھنا کہ کس حال میں ہو؟ آخر آپ کیا جاننا چاہتے ہیں؟ میں نے کتنے فاقے کیئے۔ کتنی راتیں کرب و پریشانی میں گزاریں۔ کتنے دروازوں پر نوکری کی بھیک مانگنے گیا اور کتنے مغرور سرمایہ داروں کی "نہیں" سن کر واپس آیا۔"

"سنئے میں کسی چیز کی تفصیل بتانے کو تیار نہیں۔ میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ میری حالت کو جانیں اور

لطف اندوز ہوں۔ میں آپ کی دل چسپی کا مرکز بننا نہیں چاہتا آپ کی دل چسپی کی دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں۔ سینما، تھیٹر، سرکس جو پسند ہو اُسے جاکر دیکھئے۔ سینما میں بڑی خوب صورت لڑکیاں موجود ہیں۔ سینما کمپنی کے مالک بڑے شریف اور مہربان قسم کے لوگ ہیں۔ بڑی محنت کے ساتھ نئی نئی صورتیں ڈھونڈ کر نکال لاتے ہیں۔ آپ کی دل چسپی کے لیئے بڑی بڑی قیمتیں انھیں دیتے ہیں۔ آپ کو اُن کا احسان مند ہونا چاہیئے کہیئے میں بھی آپ کے ساتھ اس موقع پہ شریک ہوجاؤں ــــــ"

"جب دماغ تھک جاتا ہے تو میں سیدھا سینما جاتا ہوں۔ جتنی زیادہ خوب صورت شکل پردے پر نظر آتی ہے۔ اُتنا ہی گہرا جذبۂ تشکّر میرے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اور میں اُس سرمایہ دار کی حالت پر دل ہی دل میں ایک خاموش قہقہہ لگاتا ہوں۔ میرا جذبۂ نفرت تھوڑی دیر کے لیئے سکون پذیر ہوجاتا ہے۔ یہ دیکھ کر کہ سرمایہ دار ــــــ ہاہا یہ فرعون بھی اب وہی کرنے پر مجبور ہیں، جو ہمارے سماج میں بڑے ذلیل قسم کے لوگ کیا کرتے ہیں ــــــ اجی حضرت! یہ رنڈیاں بھی نوسارے استادوں کی بیٹیاں نہیں ہوتیں۔"

"مجھے بڑی خوشی ہے۔ اب ریت پر تعمیر شدہ

یہ عمارت جسے آپ نے سماج کا نام دے رکھا ہے، بہت جلد گرنے والی ہے۔ آپ لوگ تو تھوپ تھاپ کی کوشش بیکار ہی کر رہے ہیں، اصلاح —— دیوانگی۔

"جی ہاں یہ سمجھ لیجیے گا کہ سینما والے ہی یہ حرکت فرما رہے ہیں۔ سنئے اپنے دوسرے بھائی کی کہانی —— بہت بڑے ٹھیکے دار ہیں۔ چھ دن کی بات ہے، انھیں ایک چیز کی ضرورت پڑ گئی۔ فوراً چیزیں دینی تھیں —— اسٹیشن پر معلوم ہوا کہ کسی دوسرے کے نام وہی چیز آئی ہوئی ہے، کسی دوسرے نے منگائی تھی، اُنھیں جاکر اُس ٹھیکے دار سے خرید لینا چاہئیے تھا —— جی نہیں، ریلوے کے بابو کو بلاکر اُنھوں نے وہ سامان نیلام کرادیا، اور خود خرید لیا۔ یہ ہے بڑوں کی ایمان داری۔ کیا سمجھے آپ! لیکن آپ اُس ٹھیکے دار سے ہمدردی نہ کریں۔ موقع پر وہ بدمعاش بھی یہی کرتا —— آخر اُس کا کام ہوگیا۔ رات کے وقت خوب ناچ اور گانا ہوا۔ وہی جو سینما والے کرتے ہیں۔"

"اور سنئے ایک زمین دار صاحب! رئیس ابن رئیس۔ بڑے قدیم گھرانے کے چراغ۔ جن گھرانے کی شرافت ثقافت، قدامت، اور نہ جانیں کیا کیا چیزیں مشہور ہیں۔ جی تو

اُن کے گھر رات محفل تھی ۔ وہی نمائشِ حسن ! جی قدامت، شرافت، ثقافت !!"

"فرق صرف اتنا کہ سینما کمپنی کا مالک عقل مند ٹھیکہ دار عقل مند ـــــــ اور یہ زمین دار احمق ! اُن دونوں نے کمایا اور لطف اٹھایا ۔ انھوں نے لطف اٹھایا اور گنوایا ـــــــ بس فرق وہی تاجر اور زمین دار کا ۔ وہی فرق جو ایک زمانے سے سرمایہ داروں کی اِن دونوں جماعتوں میں آرہا ہے ۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان ۔ حُسن کا پیاسا ہے ۔ جلوے دیکھنے کے لیے بے تاب ، جبھی تو یہ "مطالبہ اور بہم رسانی" کا سلسلہ مختلف صورتوں میں جاری ہے .... اور ہے بھی کچھ ایسا ہی ۔ مدتوں سے ہندوستانی حسن گرفتار قفس ہے ـــــ اب وہ بھی آزادی کا مطالبہ کر رہا ہے ۔ اور آزادی دینے والے بھی پیدا ہو رہے ہیں ـــــ آجائیں سب بازار میں ۔ پھر امتیاز بھی باقی نہ رہے گا ، بڑا سکون ہوگا ۔ نوجوانوں کی پیاس بجھ جائیگی اور اُن کا بہت سا وہ وقت جو حُسن کی تلاش میں بیکار صرف ہوتا ہے ، کسی بہتر کام میں خرچ ہوگا ۔ وہ صلاحیتیں جو رومان بناتی ہیں ، کسی بہتر کام میں خرچ ہوں گی !"

"سنئے حضرت! اب میں تنگ آتا جارہا ہوں آج میں اُس موٹے کے پاس جاؤں گا جو آپ کا دوست ہے۔ اُس سے سیدھے سیدھے طریقے پر دس ہزار کا مطالبہ کروں گا۔ اگر اُس بھینسے نے نہیں دیا تو پھر اُس کی توند چاک کردوں گا یا خودکشی کرلوں گا۔ خودکشی صرف ناکامی کی صورت میں ——"

"خودکشی! بہت آسان کام ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بزدلانہ فعل ہے، پھر بھی کیا کروں —— میری تیس کتابیں تیار ہیں۔ مگر سب کو جلاکر خاک کردوں گا۔ کیا وجہ ہے کہ ان کتابوں کو شایع کروں۔ اور یہ ان کتابوں پر بھوکے کتّوں کی طرح گریں —— پڑھیں اور فائدہ اٹھائیں —— میں نہیں چاہتا کہ یہ کتّے میرے دماغ کے پھینکے ہوئے ٹکڑوں سے اپنے دماغ کو موٹا کریں۔ یہ کتّے"

"اچھا حضرت! سلام لیجئے۔ اور اُن تمام لوگوں کو خوش خبری دے دیجئے۔ جو بڑی مہربانی سے تھوڑا سا وقت میرے ذکر میں خرچ کرتے ہیں، بہرحال یہ میرا آخری خط ہے۔ اگر خودکشی نہ بھی کی تو خط نہ لکھوں گا۔ ایک تو بیسیوں کا خرچ۔ پھر اس سے زیادہ یہ کہ آپ لوگ خطوں کے بہانے

سے ہی میرے دماغ سے کچھ نچوڑ لینا چاہتے ۔ آپ کا دل چاہتا ہے تو خط لکھ دیجئے گا۔ ورنہ میں زیادہ فکر مند بھی نہیں ہوں ——

دنیا میں کسی کا نہیں

افضل

خط پڑھ کر اسلم گھبرا گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ افضل خون کرنے کے بعد گرفتار ہو چکا ہو گا۔ یا خودکشی کر لی ہوگی۔ اسلم پریشان تھا۔ افضل برا یا بھلا جیسا بھی سہی۔ اُس کا چچا زاد بھائی تھا۔ اور بچپن کا دوست۔ شروع ہی سے اُس کی طبیعت نرالی تھی، والدین نے مجبور ہو کر تعلیم ترک کرا دی۔ اور وہ آوارہ پھرنے لگا۔ والدین کا خیال تھا کہ وہ پیدائشی پاگل ہے۔

اسلم کے لیئے سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ خط پر پتہ تک نہ تھا۔ آخر وہ جاتا کہاں، باقی رہی لفافے کی مُہر۔ تو افضل کے لیے یہ بڑا آسان کام تھا کہ خط کہیں سے لکھے اور ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر کسی مسافر کو دیدے۔ اور اُس سے کہے کہ جب اپنے شہر میں اُترنا تو یہ خط ڈاک میں ڈال دینا۔ یہ اُس کی بڑی پرانی ترکیب تھی —— اسلم سوچ رہا تھا کہ جا کر اُس کے بڑے بھائی کو خبر کر دے۔

اسلم اٹھا کہ جائے۔ اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب اُس نے دیکھا کہ افضل نہایت شاندار سوٹ میں اُس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا ہے۔ اسلم تھوڑی دیر عجیب عالم میں رہا۔ اُسے یقین ہوگیا کہ اُس نے یا تو اُس "بھینسے" سے روپیہ وصول کرلیا۔ یا اُسے قتل کرکے روپے لے آیا، اور اب وہ انتظار کر رہا تھا کہ افضل گرفتار ہوگا۔ وہ افضل سے ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ افضل نے خود ہی کہا ـــــــ

"تم پریشان ہوگے میرا خط پڑھ کر۔ وہ تو مذاق تھا تم سے میں نے نہ تو بھینسے کو قتل کیا ہے اور نہ دھمکی دے کر اس سے روپیہ لیا ـــــــ جاؤ اپنی بھاوج کو موٹر سے اتار لاؤ ـــــــ"

اسلم کی گھبراہٹ کی اور کوئی حد نہ رہی۔ افضل اور ـــــــ اُس کی بیوی؟ یہ شخص جس نے ساری زندگی بیاہ نہ کرنے کا عہد کیا تھا۔ جسے عورتوں سے نفرت تھی، اُس نے کہا ـــــــ

"تم افضل! شادی ـــــــ"

"پاگل نہ بنو۔ میں ایسی حماقت نہیں کرتا۔ یہ عورت میری بیوی ضرور ہے۔ سنو! اسے یہ خبط ہے کہ وہ مجھ

سے محبت کرتی ہے؛ اور یہ بھی دھوکا ہے کہ میں بھی اُس سے محبت کرتا ہوں ـــــ بہرحال اسے بھی اپنا خبط آزما لینے دو جب تک اس فریب میں رہے، میرے ساتھ رہ سکتی ہے۔ مجھے بھی بہرحال ایک عورت کی ضرورت ہے۔ جب اُس کا دل بھر جائے گا، خود چلی جائے گی۔ میرا کیا لے گی غریب ـــــ

اسلم کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ افضل نے بات کاٹ دی "گھبراؤ نہیں۔ میں نے کسی مجبور عورت کو شکار نہیں کیا ہے۔ یہ خود شکاری عورت ہے۔ طوائف ہے، تھیٹر کمپنی کی مالک ـــ مشہور ایکٹرس نرگس! یہی ہر روز ہوتا ہے اسلم! آدمی بہت سے روپے کسی کام میں لگاتا ہے، اس لیے کہ اُسے بڑا نفع ہو۔ لیکن کبھی پھنس جاتا ہے۔ یہی حال اس غریب کا ہے ـــــ جاؤ لے تو آؤ اسے ـــــ دیکھو تمھاری بھاوج کتنی خوب صورت عورت ہے۔

اسلم گیا۔ اور ایک عورت کو ساتھ لے کر آیا۔ بےحد خوب صورت عورت ـــــ اگر بےچاری خوب صورت نہ ہوتی تو اتنی مشہور ایکٹرس کیسے ہوتی؟ ـــــ نرگس آگئی اور کمرے میں بیٹھ گئی۔ افضل نے کہا۔

"اسلم! سب سے یہ اپنی خوب صورتی کے دام

وصول کرتی ہیں، اور میں ان سے اپنی خوب صورتی کے ــــــ
آخر میں انھیں خوب صورت معلوم کس طرح ہوتا ہوں ایک
دن میں نے ان کا تماشہ دیکھا۔ تماشہ خراب تھا۔ میں نے
خط میں نکتہ چینی کی ــــــ انھیں پسند آئی۔ مجھے دعوت
دی۔ میں گیا۔ پھر باتیں ہوئیں۔ باتوں کے ساتھ میں بھی
انھیں پسند آگیا ــــــ جی! تم اندازہ کرسکتے ہو کہ میری تما
باتیں شروع ہی سے کتنی پسندیدہ ہوا کرتی ہیں۔ تم جانتے ہو
کہ عورتیں ہمیشہ سے احمق ہوا کرتی ہیں۔ یہ بھی اپنی حماقت
کا شکار ہیں۔ ساری دنیا یہ کہتی ہے کہ میری باتیں دل دکھا
والی ہوتی ہیں۔ یہ کہتی ہیں کہ انھیں بہت پیاری معلوم ہوتی
ہیں۔ پوچھو ان سے ــــــ
اسلم حیرت میں تھا کہ۔ افضل کی باتیں بھی
بھی دل آزار تھیں، لیکن نرگس اُس کی ساری باتوں
مسکرا مسکراکر سنتی رہی۔ افضل کے اصرار پر اُس نے
پوچھا۔
"واقعی آپ ــــــ"
"جی ہاں۔ مجھے ان کی باتیں پیاری ......
نرگس نے ... افضل ... بات کاٹ دی

اور بولا۔

"خدا کے لیے آپ اس غریب سے مسکرا کر اور آنکھیں مٹکا کر باتیں نہ کیجیئے۔ معلوم ہے آپ ایکٹریس ——— وہ افضل نہیں اسلم ہے۔ تاب نہ لاسکے گا۔ نہ جانے اس کی کتنی راتیں آپ کے تصور میں برباد ہو جائیں گی ———"

نرگس نے پھر اُسے مسکرا کر دیکھا۔ پھر بولی۔

"جی نہیں ———"

اسلم نے کہا ———

"میں ذرا گھر پہ خبر کردوں۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں میں صرف تم سے ملنے آگیا ——— خیر چلو خبر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم تینوں ایک ساتھ چلے چلیں۔ بڑا لطف آئیگا۔ پاگل افضل اور اس کے ساتھ ایک عورت! مگر ٹھیرو۔ میں صرف پانچ منٹ کے لیے بھائی صاحب سے مل لوں ———"

اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکلا۔ اور دروازے سے نکل کر دوسرے مکان میں چلا گیا ———

اسلم کے لیے یہ چند منٹ بڑی مشکل کے ہوگئے محض گفتگو جاری رکھنے کو اس نے پوچھا ———

"آخر آپ ان سے کس طرح نباہ لیتی ہیں ــــــ"
"نرگس نے مسکرا کر کہا۔"
"محض میری زندگی کا ردِّ عمل ہے ـــــــ"
"یعنی ؟"
اسلم نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔ وہ پھر مسکرائی
اور بولی۔
"آپ کو کیا معلوم۔ کتنوں کے غرور ہر روز میرے
قدموں پر چور چور ہوتے ہیں۔ کتنے ہیں جو سرِ نیاز خم کر جاتے ہیں
اور میں ٹھکرا دیتی ہوں۔ میرا دل بھی یہی چاہتا ہے کہ دوسروں کو
ٹھکرانے کے بعد ٹھکرائی جاؤں ـــــــ اور یہی......"
اتنی دیر میں افضل واپس آگیا اور آتے
ہی بولا۔
"بھائی صاحب کو سلام کیا۔ اور محمودہ پر قبضہ
کرنے کی مبارک باد دے آیا۔ دراصل میرا فرار اُن کو مبارک باد
ہی تو ہے ـــــــ کیوں تمہاری بھاوج ہے تو خیریت سے
ـــــــ اچھا چلو ذرا اندر سے ہو آئیں ـــــــ"
"اور تم محمودہ سے نہیں ملے ـــــــ" اسلم
نے کہا۔

"میں کیوں ملتا۔ اب وہ میری ہے کون؟ وہ بھائی کی بیوی ہے۔ قابل عزت۔ میں نے اُس کے بچوں سے بات بھی نہ کی۔ یہ بچے محمودہ کے ساتھ میرے ہونے چاہئیں تھے۔ لیکن نہ ہوئے اتفاق۔ دنیا میں تمام سانحے محض اتفاق تو ہیں —— یہ نہ سمجھ لینا کہ محمودہ سے مجھے محبت تھی یا ہے۔ یہ محض پسند کا سوال ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ میری اچھی بیوی بن سکتی اور بس —— کیوں نرگس ——؟"

نرگس نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔

"تمھاری یہی چیز تو مجھے بُری معلوم ہوتی ہے۔ ہر وقت ایکٹنگ کی مشق —— میں ایکٹر نہیں، مجھ یہ پسند نہیں۔ تم نے آخر مجھے کیا سمجھا ہے۔ جاؤ تم۔ میں تمھارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ ورنہ وعدہ کرو کہ اب ہنسکر باتیں نہیں کرو گی۔ تمھاری ہنسی اور مسکراہٹ کی قیمت دینے والے بہت ہیں۔"

نرگس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

بے چاری عورت کتنی خوش تھی پہلے۔ وہ روتی ہوئی بولی۔

"آپ ناحق خفا ہو رہے ہیں۔ جائیے میں

نہیں ہنسو نگی"۔

افضل نے اُس کے آنسو اپنے رومال سے پونچھے۔ اور بولا۔

"یہ رونے کی بھی کوئی بات نہ تھی ——
میں نے تم کو برابر کہا کہ تم میرا ساتھ چھوڑو۔ تم مانتیں نہیں۔ دیوانی ہو تم بھی"۔

گھڑی نے تین بجائے۔ افضل اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

" اچھا خدا حافظ۔ اُٹھو نرگس گاڑی کا وقت ہوگیا"۔

نرگس بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔

" اچھا خدا حافظ اسلم صاحب —کیوں آئیے نا بمبئی"۔

اسلم اس عجلت سے گھبرا گیا۔ اور بولا۔

" کم سے کم آج تو رہیں آپ لوگ ——؟"

نرگس نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

" مشکل ہے۔ کل شام کو بمبئی میں میرا کھیل ہے کمپنی جا چکی ہے۔ اس گاڑی کو اگر چھوڑ دوں تو پھر وقت پر

پہنچ نہیں سکتی۔"

دونوں نے سلام کیا اور کمرے سے باہر نکل کر موٹر میں بیٹھے ایک لمحے میں موٹر نظروں سے غائب ——

اسلم کے لیئے یہ سب کچھ فلم کا ایک نظارہ بن کر رہ گیا۔ ابھی اُس کی حیرت دُور نہیں ہوئی تھی کہ افضل کا بڑا بھائی بھی اُس کی تلاش میں نکل آیا۔

اسلم سوچ میں پڑ گیا کہ آخر اس پاگل کے ساتھ یہ عورت کس طرح نباہتی ہے —— وہ یہی فیصلہ کر سکا کہ وہ بھی پاگل ہے۔ دونوں پاگل ہیں۔

نانی

ممتاز رات کو بہت دیر سے سویا تھا۔ ایک بجے رات تک تو اپنا نیا ناول لکھتا رہا۔ اور جب تھک کر بستر پر لیٹا تو بھی بہت دیر تک ناول ہی کے تانے بانے میں الجھا رہا۔ اس لیے صبح کو وہ دیر سے اٹھا۔ ابھی بستر سے اٹھ کر اُس نے ایک سگریٹ [illegible] اور چند کش لگائے تھے کہ [illegible]زم کمرے [illegible]ں آیا اور [illegible] نے کہا۔

"ایک بوڑھی سی عورت آئی ہے۔"

"پوچھو کون ہے اور کیا چاہتی ہے؟"

ممتاز نے کہا، اور انگڑائی لے کر بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُسے تعجب ہوا کہ عورت کیوں ملنے آئی ہے۔ [illegible] اس سے کیا کام؟ وہ چند دنوں کے لیے آیا تھا۔ اتنے میں ملازم آیا۔ اور بولا۔

"کہتی ہے کہ بفاتن نانی آئی ہے۔
ممتاز زیرلب مسکرایا۔ بفاتن نانی کی پرانی باتیں یاد آگئیں۔ ابھی وہ ملازم سے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا۔ لیکن اُسے موقعہ نہ ملا۔ دروازے کا پردہ ہٹا۔ اور بفاتن نانی کے پوپلے منہ سے ہنسی نکل کر جھری بھرے چہرے پر پھیلی نظر آئی۔ ساتھ ہی وہ بولی۔
"اچھے ہو نا بابو۔"
ممتاز ابھی ایک سوال کا جواب نہ دے سکا تھا کہ بفاتن نانی اپنی تان بھری آواز میں بولی۔
"ہاں بچے سب تو اچھے ہے نا بابو۔ اجی بابو سلام بھی بڑھیا نانی کو نہ کیو؟ تم کو گودی کرکے کھلایا ہے۔ کتنا دکھ اٹھایا ہے لال۔ ہم اتنے سے بھی گئے۔"
ممتاز نے کہا۔
"سلام نانی۔"
"جیو خوش رہو بیٹا۔ اللہ ایک سے اکیس بنادے بیٹا بڑھیا نانی کو بھول ہی گیو؟" نانی کی آواز کی تان اور بڑھ گئی۔
ممتاز بستر پر بیٹھ گیا۔ اُس نے بڑھیا نانی کے چہرے پر نگاہ ڈالی اب وہ کمرے کے اندر تھی۔ اور اُس کے جھری بھرے چہرے پر خوشی اور ہنسی پھیلی ہوئی تھی۔

بڑھیا نے بچپن میں اُسے کھلایا تھا۔ وہ سمجھا کہ کچھ روپے پیسے مانگنے آئی ہے۔ اور اُس نے کہا۔

"نہیں نانی تم کو کیسے بھولیں گے۔"

یہ کہہ کر اُٹھ کر اس نے تکیے کے نیچے سے بٹوہ نکالا اور پانچ روپے کا نوٹ نکال کر نانی کی طرف بڑھایا۔ نانی نے روپے لے لیئے اور اتنے زور سے ہنسی کہ اس کا سارا جسم ہل گیا اور بولی۔

"تم کو اللہ لاکھوں دے میرے لال بڑھیا کا کھیال کیؤ۔"

ممتاز سمجھا کہ نانی کے آنے کا مقصد پورا ہو گیا اور اب وہ چلی جائے گی۔ لیکن نانی کہاں جانے والی تھی۔ "بیٹا یہ نگوڑا نوکر تمرا ہم کو گھسنے نہ دیتا تھا۔ یہ چار دن سے آیا تو مالک بن گیا۔" ممتاز نے نانی کو دیکھا اور کہا۔

"نیا آدمی ہے نانی جانتا نہ تھا۔ اسے کہہ دونگا۔"

"جیؤ جیؤ میرے لال۔"

"کتنا کماؤ ہو بابو۔"

ممتاز کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس سے نانی کو کوئی مطلب نہ تھا۔ کوئی دوسرا یہ سوال کرتا تو وہ زور کی

ڈانٹ بتاتا لیکن نانی نے سچ مچ اس کی بڑی خدمت کی تھی اس
سے بے مروّتی کرنا ناممکن تھا ۔ اُس نے کہا ۔

" اللہ کا شکر اور تیری دعا ہے نانی "

نانی نے فوراً کہا ۔

" ہتنھیو بابو ہتنھیو ؟"

" بس اتنا نانی کہ کام چل جائے ۔۔۔"

ممتاز نے ہاتھ پر بندھی گھڑی دیکھی نو بج رہے
تھے ۔ اس نے نانی کو دیکھا ۔ نانی اپنی جگہ پر پہاڑ بنی کھڑی تھی ممتاز
سے نظر ملتے ہی بولی ۔

" چھپاوے ہے بیٹا ۔ آج کل کے سب لڑکن
چھپاویں ہیں "

ممتاز نے کہا ۔

" اچھا نانی اب جا ۔ پھر آنا "

" آئے بیٹا ! جو کام سے ہم آئے ہیں او تو
ہوئے بے نا کیا "

ممتاز بولا ۔

" کیا کام ؟ ۔۔۔"

" اے بیٹا نمرا ماموں چھو مہینے سے کلکتہ گیا ہے

ہم لوگ کو ایکو پیسہ نا بھیجین ہے۔"

ممتاز نے کہا۔

"تو اس کو خط لکھواؤ——"

"لکھوایا تو بیٹا۔ ایکو کا جواب نہ آیا۔ لوگ کہین ہیں

کہ کھت پہنچ نہ پایا۔ اسے ہی واسطے تو آئیں ہیں۔ میرے لال

ایک ٹھو کھت توں لکھ دو۔ انگریجی کھت ضرور پہنچے ہے۔"

یہ کام مشکل تھا۔ ممتاز گھبرایا۔ اور اُس نے کہا۔

"نانی کسی لڑکے سے لکھوا لے۔"

رمضان نانی بولی۔

"ہوں۔ میرے لال سے کون اچھا لکھنے والا پیدا

ہوا ہے۔ بس دو کلم بیٹا۔ لکھ دو تو نانی کا پہاڑ کٹے۔ توری موانی

لڑکن سب بہت تکلیف میں ہیں۔ جانو بیٹا توری سبراتن کھالا کا مرد

بھی بڑکھا گئی ہے۔ دو تین مہینے سے او بھی کچھ نہ بھیجیں ہم سب

کا گجارہ کیسے ہوگا لال میرے۔"

"نانی کسی سے لکھوا لے جا کر مجھے بہت سا کام ہے"

"ارے بیٹا توں کھبرنا لوگے تو کون لے گا۔ دوئے کلم

بیٹا۔ انگریجی میں۔ ہم تو سب کے آوے کو بوتے دوسرے سے

لکھوے ہے نا کیا۔"

ممتاز سمجھ گیا کہ بغا تن نانی کو ٹالنا آسان نہیں۔
جب وہ بدن کو لپٹیں تو لپٹیں۔ کب چھوڑنے کا نام لیں گی۔ بہتر یہی ہے۔ کہ اُن کا خط لکھ کر انھیں ٹال دیا جائے۔ اُس نے کہا۔
" اچھا نانی بیٹھ لکھتا ہوں تیرا خط۔ ذرا منہ ہاتھ دھولوں "
" بیٹا وہ کلم تو ہے۔ لکھ کے منہ دھو لیجو جین سے "
کبھی کبھی نیک بختی کا پھل مستقل عذاب کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ ایک تو نانی کے پرانے احسان کا بدلہ جب ٹانگ درست نہیں تھی نانی نے کندھے پر بٹھا کر بیسیوں تماشے دکھلائے تھے۔ جو چیزیں گھر میں کھانے کی ممانعت تھی۔ نانی چھپے چوری کھلا دیتی تھی۔ پھر بچپن میں اس کا گھر دن بھر کا اکھاڑہ بنا رہتا تھا۔ نانی نے بہت مرتبہ بازار سے اُسے گڑ کی مٹھائی اور رنگا ہوا ڈنڈا لاکر دیا تھا۔ آخر اتنا بھی نہ کرتا نانی کے لیے۔ اس نے نانی کے ہاتھ سے پوسٹ لے لیا۔ اور سرھانے سے اپنا قلم نکالکر بولا۔
" اچھا بولو نانی۔ کیا لکھا جائے ـــ "
" ہاں بیٹا لکھو۔ عیدو کو ماٹے کی طرف سے بہت بہت دعا "
نانی چپ ہوگئی۔ ممتاز نے اس مضمون کو اپنی زبان میں سدھار کر لکھ دیا۔ اور انتظار کرنے لگا کہ نانی کچھ اور بولے۔ جب

وہ برابر اُس کا منہ تکتی رہی تو ممتاز نے کہا۔

"اور نانی"

"ہاں بیٹا! - لکھیو نا - آگے معلوم ہو کہ تم جب
سے گئے ہو - ماں کو بھول گئے۔"

نانی پھر چپ ہو گئی - اور اپنی میلی میلی آنکھوں
سے ممتاز کو تکتی رہی - ممتاز بولا۔

"ہاں نانی اور —"

نانی بولیں۔

"کا لکھیو بیٹا جرا پڑھ کے سنا دو"

ممتاز نے کہا "نانی بس ایک بار سنائیں گے"

"نہیں بابو میرے جرا سنا دو تو سمجھ میں آوے گا"

ممتاز نے لکھا تو تھا اپنی زبان میں - لیکن نانی کی
زبان میں بات دہرا دی - نانی خوش ہو گئی اور بولی۔

"جیو میرے میرے لال - اور یہ کہ جب سے تم
گئے ہو ماں کو بھول گئے"

"یہ تو لکھا گیا نانی"

"ہاں ہاں - ارے دماگ کام اب نہیں کرے
بیٹا - ایک دن تھا - کہ بیٹھ کر سولہ سولہ گھنٹ لکھا دیتے رہیں - اب

کا کریں بڑا ای آ گئی نا بیٹا ۔ آنکھ سے تو دیکھتی نہیں ۔ چلا پھرا بھی نا جات ہے کا کریں بیٹا سب ترے پڑے ہے ۔ اور نا کریں تو کون کرے بیٹا ۔ ای تو ای موانی ۔ ارے مولا ایسی نک چڑھی ہے ۔ دن بھر جھگڑا کرے ہے بیٹا ۔ کام نہ کریں تو چار ٹھو دانہ کھائے کو بھی نہ دے توں سب تو شہر میں رہے لگیو ۔ ہیاں رہتیو تو ہمراہ ای دن کا ہے کو ہوتا میرے لال ۔ روج صبح اُٹھ بہو کی بات سنے پڑے ہے ۔ اور بیٹا بھی جورو کا ہو گیا ۔

نانی کی بات بڑھ چلی تھی ۔ مگر ممتاز نے ٹوک دیا ۔

"ارے نانی خط تو ختم کرے"

"ہاں بیٹا لکھو ۔ کہ ہمرے لڑکن کے تن بدن پر کپڑا ہے اور نہ پیٹ میں دانہ ۔ آکھر تم سمجھو کا ہو ۔ ہیاں جمینداری دھری ہے ۔ کا کہاں گئے ۔ اور کا پیٹ گے ہم سب ۔ تم کماؤ اور کلکتہ میں موج کرو ۔ اور ہم لوگ دکھ سہیں ۔ ای کتنی بری بات ہے ۔ تم کو اپنے عنانہ کا بھی کھیال نہیں ۔ سبراتن کا مردوا بھی کھرچہ نہیں بھیجتا ۔ او بھی ہئیں دکھڑا مجوری کر کے دن کاٹ رہی ہے"

نانی پنجاب میل کی طرح چلیں ۔ ممتاز کے لیے ان کا پیچھا کرنا مشکل ہو گیا ۔ تو بولا ۔

"بس نانی بس ۔ ذرا لکھ لینے دے"

نانی چپ ہو گئی۔ اور نظر گھما گھما کر کمرے کی ساری چیزوں کو دیکھنے لگی۔ اور دیر تک دیکھتی رہی۔ ممتاز نے پوچھا۔

"ہاں نانی۔ اور"

"ہاں بیٹا ہاں۔ جرا سنا دو بیٹا کا لکھیو——"

"نانی ایک ہی بار سنا دیں گے۔ جو کچھ بتایا تھا وہی ہے۔"

"اچھا یہ——ہاں——ہاں لکھو——اب ہم لوگ بہت دکھ اٹھایا۔ بہت دکھ سہا۔ تم کو جرا بھی سرم نہیں آتا۔ تو ہم لوگ کا کریں۔ کرجا گوام کہ سب لوگ نکلنے چلے آویں گے——اور کا کریں بیٹا ہتیاں مٹی کھود کے کھائیں——اور توں اپنے طرف سے بھی لکھ دو بیٹا—— ہاں ہاں بیٹا لکھ دو کہ تمری عورت کے واسطے صابن۔ ناریل تیل بھیج دے کوئی آوے تو۔ اور لڑکن واسطے بسکٹ مٹھائی—— جب کوئی آوے ہے بیٹا تو لڑکن دیکھ کے ترسے ہیں۔ اور بیٹا اِی بھی لکھ دو کہ سبراتن پر کپڑا نہیں ہے۔ کوئی آنے سے دو تھو ساری بھیج دو اور اُس کا مرد سے مل کر پوچھو کھرچا کا ہے نہیں بھیجتا۔ اِی بھی کوئی بات ہے۔ کھائی بیاہ کرے کا شوک چڑھتا ہے۔"

"بس بس نانی۔"

ممتاز نے کہا۔ اب پوسٹ کارڈ میں جگہ نہیں رہی۔"

"آئے بابو کھتم پوس کارٹ۔ ابھی کتنا بات باکیۓ رہ گیا۔ اب کا ہوگا ــــ اچھا بابو تپلا تپلا چار ہرپ اور لکھ دو کی روپیہ جلدی بھیج دو۔ اور کپڑا۔ صابن، بسکٹ مٹھائی ــــ اور ہاں بیٹا ہمرے واسطے ایک تھو موٹی کنگھی۔ بڑی سر میں جوئیں ہوگئیں ہے بیٹا۔ کوئی نہ دیکھ دے ہے بیٹا کا کریں۔ اپنے آنکھ سے تو سوجھے نا کرے ہے۔ ٹٹول ٹٹول کے ل جاہے تو ماریں ہیں ــــ ہاں جیو میرے لال جرا ایک بار پڑھ کے سنا دو۔"

ممتاز نے اپنی زبان میں پورا خط لکھ دیا تھا۔ نانی کی بکواس اسے یاد نہ رہی تھی۔ اس نے جو کچھ لکھا تھا پڑھ کر سنا دیا نانی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور وہ بولی۔

"ای تو کچھ نہ ہوا بیٹا۔ مپھت میں پوس کاٹ بھی کھراب گیا۔

ممتاز نے جلدی سے پوسٹ کارڈ نانی کو دیا۔

گھڑی دس بجارہی تھی۔ وہ غسل خانے میں گھس گیا اور دیر تک سوچتا رہا کہ ناول کا ایک باب لکھنا مشکل ہے کہ نانی کا ایک پوسٹ کارڈ۔

سہیل عظیم آبادی